علمی، تحقیقی ادبی فکروں کا بے باک ترجمان

ماہنامہ

الماس

ممبئی

مدیر

مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی

معاون مدیر

مولانا حفظ الرحمٰن اعظمی

غیر موقت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

علمی، ادبی اور تحقیقی فکروں کا ترجمان

الماس ممبئی

جلد نمبر: ۴، شوال المکرم، ذی القعدہ: ۱۴۴۵ھ، مطابق مئی: ۲۰۲۴ء، شمارہ نمبر: ۵

سرپرستان

مولانا شفیق احمد قاسمی امام وخطیب عرب امارات

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی رفیق اعزازی دارالمصنفین

مدیر تحریر: مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی

معاون مدیر: مولانا حفظ الرحمن الاعظمی

مجلس مشاورت

مفتی ارشد صاحب شیروانی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا ضیاء الحق خیرآبادی، منظر خیامی، مولانا مفتی ذیشان قاسمی، عامل صدیقی، اسرار احمد سکریٹری جامع انوار

زر تعاون

فی شمارہ: ۵۰/روپئے

سالانہ: ۵۰۰/روپئے

سالانہ خصوصی: ۲۰۰۰/روپئے

ترسیل زر کا پتہ: A/c:36698100019662

IFC code: BARB0TILCHE

مجلس ادارت

مولانا محمد عرفات اعظمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی رضوان قاسمی، مفتی عبید اللہ شمیم اعظمی، مولانا قمر الحسن مہراج گنج، مولانا سرفراز قاسمی، مولانا عبد العلیم اعظمی، مولانا عبد اللہ اعظمی

تزئین: خورشید احمد الاعظمی

ناشر: ادارہ فکروفن، **انوار جامع مسجد**، شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی، انڈیا

Mobile: 8767438283, 7905452498, 9336482291

Email:sharfuddinazeem@gmail.com, almaasmumbai@gmail.com

اس شمارے میں

اداریہ	آئینۂ ایام	مدیر اعلیٰ	۳
مقالات ومضامین	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حیات بخش فرمانروا	مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی	۷
// //	غیر ملکی زبان میں تعلیم اور اس کے نقصانات	پروفیسر ڈاکٹر قاضی سراج اظہر امریکہ	۱۱
// //	اسلام اور تعلیمِ نسواں	مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی	۱۵
// //	گلدستہ حیات کی مہکار ''ماں'' اور مدر ڈے کی	ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی	۲۰
// //	انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا شرعی حکم	مولانا نسیم ظفر بلیاوی قاسمی	۲۳
وفیات	وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا	مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی	۲۷
//	رنج کس کا ہے کہ ساری انجمن خاموش ہے	مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی	۳۱
ادبی شاہکار	تاروں بھرے آسمان سے یہ مٹھی بھر تارے	خواجہ کوثر حیات اورنگ آباد	۳۴
تعارف کتب	خانوادہ شبلی	عبدالعلیم الاعظمی قاسمی	۳۹
// //	امام عصر علامہ کشمیری اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل	مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی	۴۴
آپ کے مسائل		احمد نبی نداف	۴۶
آپ کے مسائل	حج بدل، رمی، میدان عرفات کے مسائل	مفتی محمد آزاد بیگ قاسمی بہرائچی	۴۷
غزل	نہیں حکمرانوں کو ہے اس سے الفت	مرزا انور بیگ	۴۸
//	قطعات	مصداق اعظمی	۴۸

اداریہ:

آئینہ ایام

مدیر اعلیٰ

قیادت کا اصلی چہرہ:

فرقہ پرستی کی تھیوری پر یقین رکھنے والی اور عملاً اس پر پوری قوت سے چلنے والی قیادت کی ۲۱/اپریل ۲۰۲۴ء بروز اتوار ایک انتخابی ریلی میں مسلم دشمنی میں کھل کر سامنے آ گئی، اس ریلی میں کھلے لفظوں میں ملک کی قیادت نے مسلمانوں کو گھس پیٹھ کی گالیاں دیں، انہیں حقارت سے سب سے زیادہ بچے پیدا کرنے والا کہا، راجستھان کے ٹونک خطے میں ملک کے رہنما نے ایک بڑے مجمع سے تقریر کے دوران کہا کہ، اگر مخالف پارٹی کانگریس اقتدار میں آئی تو آپ لوگوں کی جائیدادوں کو ان کے درمیان تقسیم کر دے گی، انھوں نے حوالے کے طور پر سابق وزیر اعظم منموہن سنگھ کے اس جملے کو بطور حوالہ پیش کیا ہے کہ ملک پر مسلمانوں کا حق پہلے ہے،، ملک کا عام فرد یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کا ذکر ان کی قربانیوں اور پھر آزادی کے بعد ان حقوق کے مسلسل استحصال کے تناظر میں ہے، مگر جب اذہان تعصب کے خول میں بند رہتے ہیں تو انصاف کے ایوانوں سے بھی ظلم کی راہیں نکال لی جاتی ہیں، اہم بات یہ ہے کہ منموہن سنگھ نے اس طرح کا جملہ کہا ہی نہیں ہے، ۲۰۰۶ء کی تقریر میں منموہن سنگھ نے ملک کی اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کو بااختیار بنانے کی بات کی تھی کہ ملک کے وسائل پر ان کا پہلا حق ہونا چاہئے، تاکہ وہ ترقی کے ثمرات میں حصہ لے سکیں، اس میں مسلمانوں کا ذکر سرے سے ہے ہی نہیں، یہ بالکل واضح ہے کہ اس کے ذریعے مسلمانوں کو نشانہ بنانے والے کی تلبیسانہ مہارت اور دسیسہ کاری ہے، تاکہ اس کے ذریعے مذہبی منافرت کے شعلے بلند ہوں اور بکھرتے ہوئے ووٹ متحد ہو جائیں۔

جمہوری آئین کے مطابق انتخابات کی تاریخوں کے اعلان کے بعد قریبی مدت میں انتخابی جلوس، روڈ شو، کنوینسنگ کی سرگرمیاں موقوف ہو جاتی ہیں، خلاف ورزی کی صورت میں امیدواروں اور پارٹیوں کے خلاف کارروائی ہوتی ہے، لیکن یہاں ایک بڑی ریلی میں نہ صرف اپنی تشہیر اور حزب مخالف پر الزامات کی بارشیں کی گئیں بلکہ الیکشن میں فتح کے لئے دوسری اکثریت کے خلاف متعصّبانہ اور فرقہ وارانہ بیان دے کر نفرت وعداوت کے جذبات کو شعلوں میں بدلنے کا کام کیا گیا ہے۔

آئینی اور قانونی لحاظ سے یہ طرز عمل جہاں جرم کے زمرے میں آتا ہے وہیں اخلاقی اعتبار سے بھی یہ

انسانیت سوز کردار ہے، قیادت صرف ایک کمیونٹی کی نہیں بلکہ جمہوری آئین کی رو سے ملک کے تمام طبقات کی ہے، اس بیانئے سے آئین پامال ہوا ہے ملک کی شبیہ داغدار ہوئی ہے، ایک بڑے منصب اور عہدے کی بدنامی ہوئی ہے اور سب سے بڑھ کر قیادت عظمیٰ کی متعصّبانہ فکر اور سوچ پوری حشر سامانیوں کے ساتھ باہر آئی ہے۔

ہونا تو چاہیے تھا کہ پورے ملک کی سیاسی، سماجی اور ملی تنظیمیں اس پر احتجاج درج کراتیں، کورٹ میں اس کے خلاف اپیلیں دائر کرتیں، الیکشن کمیشن کو اس کی سنگینی اور خطرناک اثرات سے آگاہ کراتیں، مگر نیند کا خمار بہت گہرا ہے، خوف کی چادر ہے کہ اس نے تقریباً تمام قیادتوں کے لب مقفل کر دیئے، کچھ آوازیں اٹھیں اور صدا بصحرا ثابت ہوئیں، الیکشن کمیشن جس نے حال ہی میں گجرات میں مفروضہ الزامات کے ذریعے حکمراں جماعت کے مخالفین کو نااہل قرار دے کر بی جے پی امیدوار کو فتح کا تحفہ دیا ہے وہ اس پر کیوں ایکشن اور نوٹس لیتا، چنانچہ اب تک اس نے اس بیانئے پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا ہے، ایسے جانبدار اور متعصب ادارے کی نگرانی میں انتخابات کہاں تک منصفانہ ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ ہر شخص لگا سکتا ہے، یہ وہی نگراں ادارہ ہے جس نے الیکشن کے لئے دو ماہ کی مدت متعین کی ہے مگر جب اس سے سپریم کورٹ نے مشین کے ساتھ بیلیٹ پیپر کی کاونٹنگ کا حکم دیا تو اس نے کہا کہ اس میں بہت وقت درکار ہے، اس جواب پر عدالت یہ کہنے پر مجبور ہوئی کہ انتخابات کیلئے دو ماہ کی مدت لی جا سکتی ہے تو پیپر کے لئے کیوں نہیں۔

یہ حقیقت بھی بالکل عیاں ہے کہ موجودہ قیادت میں ملک میں مسلمانوں کے خلاف کھل کر انتقامی کاروائیوں کا سلسلہ جاری رہا، نہتے افراد پر شر پسندوں نے بے خوف ہو کر حملے کئے، دشمن عناصر نے جہاں چاہا فساد کیا، اشتعال انگیز نعرے لگائے، قتل و غارت گری کی، املاک و سرمائے کو لوٹا، مسجدیں مسمار کیں، ظلما مسلم نوجوانوں کو شری رام کہنے پر مجبور کیا، پولیس نے ہر بہانے یکطرفہ کارروائیاں کر کے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، ہزاروں مسلمانوں کو بے گھر کر دیا گیا، مگر ظلم و زیادتی اور جارحیت و سفاکیت کے دوران قیادت ہر موقع پر اس طرح خاموش تماشائی بنی رہی گویا ان چیزوں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں، حالیہ نفرت انگیز بیان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ماضی کا سکوت درحقیقت مذکورہ تمام فرقہ وارانہ اور آئین مخالف کردار خاموش اجازت تھی، تاکہ دنیا میں قیادت کی شبیہ پر کوئی داغ نہ لگ جائے۔

مگر جب دنیا کی ایک بڑی جمہوریت کے اسٹیج سے سب سے باوقار منصب کی جانب سے انسانی حقوق کو پامالی کرنے والے بیانات سامنے آئیں گے تو ظاہر ہے دنیا اپنے مفادات کے باوجود اس متضاد کردار پر تنقید کا نشتر چلائے گی، امریکہ کے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز نے آخر کار یہ سرخی لگائی کہ ''مودی نے مسلمانوں کو گھس پیٹھ کہا جو بھارت کی املاک چھین لیں گے، مزید لکھا ہے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے خلاف جو راست زبان استعمال کی گئی ہے وہ عالمی سطح پر نریندر مودی کی تصویر کے بالکل خلاف ہے'' اسی طرح دی گارڈین اخبار نے بھی وزیر اعظم پر کشیدگی پھیلانے کا الزام لگایا ہے، نیز ۲۰۱۴ء سے مسلمان جس طرح تشدد کا نشانہ بن رہے اس پر بھی تنقید کی

ہے، اس کے علاوہ سی این این، واشنگٹن پوسٹ، وال اسٹریٹ جرنل، دی ٹائمز اور الجزیرہ وغیرہ نے بھی اس کردار پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے سی این این نے تو الیکشن کمیشن سے وزیر اعظم کے بیان کا جواب بھی مانگا تھا۔

ملک کے حالات کس رخ پر ہیں ماضی قریب میں حکومتِ وقت کے متعدد کرداروں نے مثلاً رام مندر کی تعمیر اور اس کے افتتاحی جشن میں بحیثیت وزارت عظمیٰ شرکت نے متعین کر دیا تھا، خوش فہمیوں کی رہی سہی رمق بھی حالیہ بیان سے دم توڑ چکی ہے۔ ایسے نازک وقت میں جہاں اقلیتوں کے حوالے سے مستقبل بالکل تاریک اور ان کے تحفظ کے سارے راستے مفقود ہوں، ذمہ داریاں مزید نازک اور سنگین ہو جاتی ہیں، دین و شریعت اور اسلامی تہذیب وتمدن تو ایک دہائی سے فرقہ پرستوں کی زد میں ہے ہی، اب تو ملت کے وجود اور اس کی بقاء کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

اس لئے وقت، ایمان اور عقل کا تقاضا ہے کہ قوم پوری طاقت سے حق رائے دہی کا استعمال کرے، مکمل شعور کے ساتھ اور اجتماعی سطح پر کسی ایک پلیٹ فارم کو منتخب کرے، غفلتوں کے حصار سے قوم اگر اس وقت بھی نہ نکل سکی تو خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جمہوری آئین رکھنے والے اس ملک میں حالیہ انتخابات آخری الیکشن ہو، اس لئے کہ زعفرانی گروپ نے تو بارہا اس کا اعلان کیا ہے، اور اس سمت میں اس کی جدوجہد بھی جاری ہے۔

قاتل انسانیت خنزیری حکومت کی شاطرانہ چال:

حالیہ مہینے کے وسط میں صیہونیوں نے دمشق میں ایران کے قونصل خانے پر حملے کر کے اچانک ماحول کو اپنے لئے سازگار بنالیا، ایران نے جوابی کاروائی کی لیکن اس طرح کہ اس سے تل ابیب کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا، اس لئے کہ جس ڈرون سے کارروائی کی گئی تھی وہ ایک سو چالیس کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کرتا ہے اسے تل ابیب پہونچنے میں دس گھنٹے لگ گئے، نیز یہ پہلے سے میڈیا میں خوب تشہیر کے بعد بھیجے گئے تھے، یہاں تک کہ ان کی سائز، تعداد اور وزن تک سے دنیا کو باخبر کر دیا گیا، ایسی تفصیلی اطلاع کے بعد آسانی سے اسرائیل ان کو ناکارہ بناتا رہا، بالآخر ۹۹/ فیصد یہ حملے ناکام ہو گئے حملے کی ان تفصیلات کے بعد ایران کے بارے میں صہیونیت سے یا مغرب سے ساز باز کے حوالے سے اگرچہ وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر اتنی بات یقینی ہے کہ اس حملے سے اسرائیل کو راست فائدہ پہونچا ہے، ۷/ اکتوبر سے مسلسل نہتے اور معصوم افراد کے قتل عام پر دنیا سراپا احتجاج بنی ہوئی ہے خود مغرب کے بہت سے ممالک نے اس حیوانیت اور جارحیت کے خلاف سخت ایکشن لیا، سفارتی تعلقات منقطع کر لئے، تل ابیب میں مہینوں سے اس ظلم و بربریت کے خلاف عوام سڑکوں پر اتری، اور مسلسل اس درندے سے استعفا کا مطالبہ کیا، کئی وزراء نے تتن یاہو کی حکومت سے استعفا بھی دے دیا، خود عالمی دہشت گرد برطانیہ اور امریکہ نے اپنی طرف سے مستقل دی جانے والی اسرائیل کی امداد موقوف کر دی۔

لیکن اس حملے سے انہیں ایک بہانہ مل گیا، صہیونی میڈیا نے اپنے عدم تحفظ کا شور مچایا اور فی الفور امریکہ نے دو ارب ڈالر کی منظوری دے دی اور پھر ایک ہفتے بعد پارلیمنٹ میں بل منظور کر کے ۲۶ ارب ڈالرز اسرائیل کے لئے خاص کر دیا۔

ایک طرف خنزیری حکومت نے ایرانی حملے کے ذریعے عرب دنیا کی توجہ حماس اور غزہ سے ہٹایا دوسری طرف مغرب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر کے ۷ اکتوبر کی پوزیشن حاصل کی تیسری طرف غزہ کی بے بس اور مجبور عوام پر بموں کی بارش کر کے دھڑلے سے قتل عام بھی کیا اور اب تک یہ سلسلہ مزید خطرناک انداز میں پوری قوت سے جاری ہے، اور اب امریکہ اور دوسرے ممالک کی حمایت غزہ کے مظالم اور بے بسی سے ہٹ کر اسرائیل کے لئے اندھا دھند جاری ہو چکی ہے، اس پس منظر میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ایرانی حملہ امریکہ اور اس کے ہمنواؤں کی ایک ڈیل تھی۔

غزہ پورا تباہ ہو چکا ہے وہاں زندگی کی اب علامت باقی نہیں رہی، جو کچھ ہے وہ بس بنیادی سہولیات سے محروم کچھ بے بس نفوس، کچھ حسرت بھری نگاہیں اور بھوک پیاس سے بلکتے ہوئے بے سہارا بچے، آتش و آہن کی اس فضا میں ان گنی چنی خوف زدہ، مصائب سے چور، بے بس و مجبور اور زخم زخم ارواح کے علاوہ پوری سرزمین پر لاشوں کے انبار، ملبوں کے ڈھیر، ویران کھنڈرات، ان گنت جنازے، لہو رنگ اجسام اور دنیا کے سب سے بدترین اور سفاک صہیونی درندوں کی صورت میں موت کا خطرناک رقص ہے۔

تاریخی کتابوں اور افسانوں میں ہلاکو، تیمور سے لیکر ہٹلر و مسولینی تک تمام ظالم حکمرانوں کے متعلق یہ واقعات کہ انھوں نے جس ملک پر حملے کیے بستیوں اور آبادیوں کو تاراج کر ڈالا، ان مظالم پر تعجب بھی ہوتا اور افسوس بھی مگر دور حاضر جو قانونی اور تمدنی عہد کہلاتا ہے اور انسانی حقوق کے تحفظ کے اعلامئے سے جس کی عالمی فضا پر شور ہے باوجود اس کے ایک غاصب اور ظالم حکومت نے ایسی درندگی، ایسی جارحیت اور ایسی بدترین حیوانیت کا مظاہرہ کیا، اور ایک ریاست کو اس طرح حملوں کا نشانہ بنایا کہ وہ مکمل طور سے کھنڈر میں بدل گئی، اتنی بے رحمی سے عوام پر بموں کی بارش کی کہ عوام کی اکثریت نے لمحوں میں دم توڑ دیا اور ہنوز اس قدر بے شرمی سے یہ خنزیری حکومت بربریت اور قتل عام کر رہی ہے کہ ماضی کی ظالمانہ داستانیں اس کے آگے بے حیثیت ہو گئیں۔

قیامت یہ ہے کہ عالم عرب خصوصاً سعودی اور اماراتی حکمراں ان دردناک مناظر کا خاموشی سے نظارا کر رہے ہیں، یہ اپنے عشرت کدے میں اس طرح داد عیش دے رہے ہیں گویا ملت اسلامیہ پر کوئی حادثہ رونما ہی نہیں ہوا ہے، انھوں نے عالمی قتل و غارت گری کے باوجود اپنے جشن اور ملکی تقریبات میں کمی کرنا گوارا نہ کیا، عالمی بازار حسن میں فخر کے ساتھ خواتین اسلام کے جسموں کی نمائش کی گئی، امریکی اور اسرائیلی مفادات کے خلاف انھوں نے اس ظلم و درندگی کے باوجود ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا، **(بقیہ صفحہ: ۳۰ پر)**

مقالات و مضامین: **دوسری قسط**

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حیات بخش فرمانروا

مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی

ہجرت مدینہ سے کئی سال قبل مدینہ منورہ میں اسلام کی روشنی پہونچ چکی تھی، وہاں کے سیاسی، اور سماجی ماحول میں بھی انقلاب کے اثرات پیدا ہو چکے تھے، مدینہ کی آبادی مختلف اقوام وقبائل پر مشتمل تھی، جن میں اوس اور خزرج نامی دو قبیلوں کے علاوہ یہودیوں کی بھی بڑی تعداد بنونظیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع کے نام سے بستی تھی، تعداد کے لحاظ سے اوس اور خزرج دونوں قبائل سیاسی، معاشی ہر لحاظ سے یہ مضبوط اور فائق تھے، لیکن خود ان کے درمیان تفوق اور برتری کی کشمکش، باہمی عصبیت ورقابت اور دشمنی وعداوت ہمیشہ سے چلی آرہی تھی یہاں تک کہ ان دونوں قبیلوں کے درمیان بعاث نامی نہایت سخت اور تباہ کن جنگ رونما ہوئی، نتیجے میں دونوں قبائل ہر لحاظ سے تباہ ہو کر رہ گئے، ان کی سیاسی اور معاشی طاقت بکھر گئی ''ایک مدت تک اوس اور خزرج کو مدینہ میں شوکت وسیادت حاصل رہی تا آنکہ ان کے ہمسایہ مغربی قبائل ان سے عہد وفا استوار کرنے لگے، لیکن بعد میں اوس اور خزرج کی باہمی خونریزیوں نے نہ صرف ان کی شوکت وسطوت کا خاتمہ کر دیا بلکہ ان کی ہوا اکھڑ گئی، یہود نے ان سے پیمان صلح توڑ دیا، یہود کو غلبہ حاصل ہو گیا''۔ (ابن خلدون، جلد نمبر: ۲، صفحہ: ۲۸۷)

اس جنگ نے مدینہ کا نقشہ بدل دیا یہود جو ان کے مقابلے میں کمتر تھے اس جنگ کے بعد سیاسی، سماجی اور اقتصادی ہر اعتبار سے انہیں فوقیت حاصل ہو گئی، یوں تو اہل مدینہ جنگ بعاث سے پہلے بھی بالکل منتشر تھے، قبیلے اور خاندان آپس میں دست وگریباں تھے، اتحاد واجتماعیت کا سرے سے فقدان تھا، باہمی عصبیت اور اختلافات وعداوت عروج پر تھی، اقتدار وحاکمیت، اور معاشرتی قوانین وضوابط سے ان کا سماج بالکل نا آشنا تھا، مگر باوجود اس کے یہودیوں پر ان کی شوکت وقوت کے اثرات بہر حال موجود تھے، اس معرکہ آرائی کے بعد جب زندگی کے اکثر میدانوں میں یہود کے قبضے ہوئے اور اہل مدینہ پر اس قوم نے سیاسی اور معاشی تسلط جمایا تو قومی حمیت کے سمندر میں تموج پیدا ہوا۔

جنگ بعاث نے اہل مدینہ کے دلوں میں جہاں کمتری کا احساس پیدا کیا وہیں آپسی رسہ کشی، انتشار و عداوت ظلم و ناانصافی کی جگہ اتحاد واتفاق، تنظیم واجتماعیت، اور سماجی وسیاسی مرکزیت کی طرف متوجہ ہونے کا جذبہ بھی پیدا کیا، اہل مدینہ اب سابقہ زندگی جو اخلاقی پسماندگی، معاشی بدحالی اور سیاسی ابتری کا شکار تھی، اس سے بالکل بیزار ہو کر ایک نئی زندگی، کی تلاش میں تھے، وہ امن وسلامتی کے طالب، انقلاب کے متلاشی اور قانون وضوابط پر

مشتمل منظم اقتدار کے خواہاں تھے، اس مقصد کے لئے انھوں نے کوششیں اور جد وجہد بھی کی آپسی اتحاد کے ذریعے عبداللہ ابن ابی کو مدینہ کا فرمانروا بنانے پر اتفاق بھی کیا، تاکہ منظم حکومت کے تحت آزادانہ اور باوقار زندگی بسر کرسکیں۔

اسی زمانے میں ۱۰ر نبوی میں مدینہ کا ایک قافلہ حج کے لئے مکہ مکرمہ پہونچا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قافلے سے ملاقات کی اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا، نتیجے میں چھ افراد حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، اس ملاقات میں قافلے والوں نے جو بات رکھی اس سے اہل مدینہ کے جو جذبات تھے اور جو ان کی خواہشات تھیں وہ کھل کر سامنے آجاتی ہیں، کہ انھوں نے دامن رسول سے وابستگی میں مدینہ کی سماجی اور سیاسی ترقی بھی دیکھی تھی، چنانچہ اسلام لانے والی اس جماعت نے آپ سے عرض کیا:

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم اپنے پیچھے ایسی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں جس میں فتنہ وعداوت اس قدر ہے کہ کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی، شاید آپ کے ذریعے اللہ انہیں باہم متحد کردے، ہم ان کے پاس جائیں گے، اور آپ کے معاملہ (نبوت) کی جانب بھی مدعو کریں گے اور انہیں بھی آپ کے اس دین کی طرف دعوت دیں گے جو ہم نے قبول کرلیا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ پر متفق ومتحد کردیا تو آپ سے زیادہ معزز وباعزت کوئی دوسرا نہ ہوگا''۔ (سیرت ابن ہشام، جلد نمبر: ۲، بحوالہ نقوش رسول نمبر: صفحہ: ۶۷)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدینہ کے ان چند افراد کی ملاقات اسلامی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی، ان کے ایمان کا اقرار اور اس کے مطابق عمل کا عہد درحقیقت وطنیت وقومیت، رنگ ونسل زبان اور قبائلی عصبیت کے بتوں کے انہدام کا مضبوط وعدہ بھی تھا، اور ان کے اتحاد واجتماعیت کا سب سے مستحکم راستہ بھی، یہی وجہ تھی کہ وہ اسلام کے سائے میں آکر نہ صرف اطمینان بلکہ فخر بھی محسوس کررہے تھے کہ یہودی قوم جو آسمانی کتاب کے ذریعے اپنی برتری ثابت کرتی تھی اس کے اختتام کا وقت آچکا ہے، اور اسلامی تعلیمات کے ذریعے ہماری عظمت رفتہ کا سراغ بھی نظر آرہا ہے چنانچہ ان لوگوں نے اس کا اظہار کرتے ہوئے آپس میں کہا کہ:

''واللہ یہ تو وہی نبی ہیں جن کا ذکر تم سے یہودی کیا کرتے تھے، دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے معاملے میں وہ تم سے سبقت لے جائیں''۔

ان چند سعادت مند افراد کی دامن اسلام سے وابستگی درحقیقت اسلامی ریاست کی عمارت کی بنیادی اینٹ تھی، اس لئے کہ ایک منظم حکومت اور کامیاب فرمانروا جس میں مدینہ کی سیاسی اور تمدنی ترقی نظر آرہی تھی وہ آپ ہی کی ذات اقدس تھی۔

چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسلام کی اشاعت وعمل کا وعدہ لے کر یہ حضرات وطن واپس ہوئے اور اس قدر اہتمام سے تبلیغی جد وجہد کی کہ مدینہ ان کی داعیانہ آوازوں سے گونج اٹھا، ان کی کوششوں کے نتیجے میں دوسرے سال ۱۱ر نبوی میں اوس وخزرج کے بارہ افراد نے موسم حج میں آنحضور سے ملاقات کی اور مشرف بہ اسلام ہوکر مروجہ

تمام منکرات سے اجتناب اور ہر طرح سے آپ کی اطاعت کا عہد کیا، اور خود کو گویا اس بات کا پابند بنایا کہ جاہلی معاشرے کے برعکس وہ بلند کردار اور عمدہ اخلاق کے ذریعے ایک معاشرے کی تشکیل دیں گے جس کی بنیاد توحید پر ہوگی اور امانت و دیانت کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام ہوگا، چونکہ اس کے لئے ایک معلم کی ضرورت تھی اس لیے انھوں نے رسول اکرم ﷺ سے ایک معلم بھیجنے کی درخواست کی آپ نے اس مشن کے لئے حضرت مصعب بن عمیر کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ حضرت مصعب کی تعلیمی و تربیتی جدوجہد اور داعیانہ کوششوں کے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے، چند سال قبل تک جہاں اوس و خزرج ایک دوسرے کے دشمن تھے وہ شیر و شکر ہو کر ایک صف میں کھڑے ہو گئے، ایک سال کی تبلیغی مساعی کے بعد جب حضرت مصعب رض مکہ واپس آئے تو مدینہ کا ماحول بدل چکا تھا، اور اسلام کی روشنی مدینہ کے اکثر گھروں کو منور کر چکی تھی، اسی کا اثر تھا کہ دوسرے سال حج کے موسم میں مدینہ سے جو وفد آیا وہ ستر نفوس پر مشتمل تھا، حضرت مصعب رض ہی نے اس جماعت کو رسول اکرم ﷺ سے ملاقات کرائی، ایام تشریق کا درمیانی وقت متعین کیا۔

چنانچہ ۱۲ر نبوی کی ۱۲ر ویں شب میں اہل مدینہ نے مقام منی میں آپ کے دست مبارک پر بیعت کی، قریش کی جاسوسی کے پیش نظر گفتگو بہت مختصر کی گئی، تھوڑی دیر کے مذاکرات کے بعد انصار مدینہ نے تمام ممکنہ خطرات کے باوجود وعدہ کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو اپنے شہر میں جائے قیام فراہم کریں گے، ہر طرح سے ان کی نصرت و حمایت کریں گے، ہر حال میں اسلام اور اپنے وعدے پر ثابت قدم رہیں گے، یہ معاملہ دونوں طرف سے بہت غور و فکر کے بعد طے ہوا تھا، ایک طرف رسول اکرم ﷺ نے اہل مدینہ کے دو سال کے طرز عمل کے بعد مدینہ کو وطن بنانے کا ارادہ کیا تھا تو دوسری طرف اس وفد نے بھی جلد بازی اور وقتی جذبات سے کام نہیں لیا تھا، بلکہ مکہ سے لیکر مضافات مدینہ کی یہودی قوم کے ردعمل، اور مخالف ماحول کا پوری طرح سے ادراک کر کے آپ کی دینی فکری، علمی، اور سیاسی قیادت کا انتخاب کیا تھا۔

اسی وجہ سے عین معاہدہ کے وقت عباس بن فضلہ انصاری نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا،، جانتے ہو کہ اس شخص سے کس بات کا پیمان باندھ رہے ہو، انھوں نے کہا ہاں، پھر اس نے کہا تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے لوگوں میں سرخ و سیاہ سے جنگ یعنی دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو، پس اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال تباہی کے اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو، کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا ارادہ یہ ہے کہ جو دعوت تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اشراف کی ہلاکت کے باوجود نبا ہو گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے، اسی قسم کی باتیں اس وفد کے ایک رکن اسعد بن زرارہ نے بھی کہی تھی کہ:

''اے اہل یثرب ٹھہرو، ہم ان کیطرف اونٹوں پر بار بار نہیں آئے، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج یہاں سے انہیں نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے اس کے نتیجے میں تمہارے لوگ قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی، لہذا اگر اس کو برداشت کرنے کی طاقت تم اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ تھام لو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر انہیں چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو کیونکہ اس وقت عذر کر دینا اللہ کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہے اس پر وفد نے پوری ذمہ داری سے جواب دیا تھا کہ ہم اسے لے کر اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں''۔ (نقوش رسول نمبر ،جلد نمبر: ۵، صفحہ: ۸۱)

معاہدے کے وقت آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ بھی موجود تھے انھوں نے بھی انصار سے مخاطب کر کے کہا تھا:

''گروہ خزرج سن لو، محمد اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں دشمنوں کے مقابلے میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے، اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے جواب دے دو، حضرت براءؓ نے آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا، ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں، وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابوالہیثم نے بات کاٹ کر کہا،، یارسول اللہ ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں، بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے، ایسا تو نہ ہو کہ جب آپ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں، آپ نے مسکرا کر فرمایا، نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں''۔ (سیرت النبی حصہ اول صفحہ: ۱۸۹ شبلی نعمانی)

یہی وہ بیعت ہے اور یہی وہ معاہدہ ہے جس نے عالمی تاریخ پر فیصلہ کن اثرات مرتب کئے، اور ایک اسلامی ریاست کے خاکے کو حقیقت کے مرحلے میں داخل کیا، اور روئے زمین پر انسانی حقوق کے تحفظ آدمیت کے احترام اور اخلاقی بلندی اور کے حوالے سے عدیم النظیر و بے مثال منصفانہ نظام و دستور پر مشتمل ایک اسلامی حکومت کی تمہید و پیش خیمہ ثابت ہوا۔

مقالات و مضامین:

غیر ملکی زبان میں تعلیم اور اس کے نقصانات

پروفیسر ڈاکٹر قاضی سراج اظہر صاحب امریکہ

اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

ہندوستانی مسلمانوں کی ساری توجہ آج کل انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کا مقصد یہ نہیں کہ غیر ملکی زبان جیسے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھی جائیں۔ اس بات کو ہم ذہن نشیں کر لیں، ہندوستانی مسلمانوں کی زبان انگریزی یا فرانسیسی نہیں ہے۔ ہماری نوخیز نسلوں کو انگریزی سے کیا واسطہ! جب ان پر ایک غیر ملکی زبان انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا جاتا ہے تو آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اُن پر کیا گذرتی ہوگی۔ کئی سال کی محنت کے بعد طلبہ ہائی اسکول ختم ہونے تک صرف کچھ کچھ انگریزی بولنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اہم مضامین کے بنیادی تصور سے بے بہرہ رہتے ہیں لیکن والدین کے دماغوں میں انگریزی کا بھوت سوار ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں یا اُنہیں کسی نے بتایا نہیں کہ مسلمان تعلیمی میدان میں کتنے آگے تھے۔ اللہ کرے ہمارا قرونِ وسطیٰ کا سُنہری دور ہمیں واپس مل جائے اور ہم سائنسی دریافت اور سائنسی تحقیق کی دُنیا میں خوب نام کمائیں اور اس کی بدولت ہمارے دینِ اسلام کا بول بالا ہو جائے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے تحقیق اور ایجاد کا کام دوسروں پر چھوڑ دیا ہے۔ ہم تو اُن کے مُقلِد اور مترجم ہو کر رہ گئے ہیں۔ سائنسی نمائش ہمارا شیوہ ہے۔ جب کہ یورپ کا بچہ بچہ سائنسی تحقیق میں لگا ہوا ہے۔ ایک نامعلوم شاعر کا شعر اس بات پہ بالکل صادق آتا ہے۔

ایسے ویسے کیسے کیسے ہوگئے کیسے کیسے ایسے ویسے ہوگئے

علامہ اقبال دل برداشتہ ہو کر کہتے ہیں:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثُریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

افسوس ہے آج ہمارے ۵۷ ممالک اپنے یورپی آقاؤں کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اپنا دین اپنی تہذیب اپنا تمدن فرنگیت اور فرنگی زبان کیلئے قربان کر چکے ہیں۔ کیا ہم اپنی زبان میں تحقیق نہیں کر سکتے؟ فرنگیت کی زبان اور اُنکی تہذیب کے گُن گانے کی ہمیں کیا ضرورت ہے۔ تحقیقی و تخلیقی صلاحیتیں کسی زبان کا ورثہ نہیں ہوتیں۔ مثلاً جب ڈاکٹر Katlin Kariko نے کوویڈ بیماری کے لئے MRNA کا ٹیکہ بنایا تو اُنہوں نے ہنگیرین زبان میں ہی سوچا ہوگا، کیونکہ اُن کی پی ایچ ڈی تک کی ساری تعلیم ہنگری زبان میں ہی ہوئی اور یہ زبان صرف ۱۰ ملین آبادی والے ملک کی زبان ہے۔ لیکن چونکہ اِس ملک میں تعلیم ہنگیرین زبان میں دی جاتی ہے، اس لئے ان میں تحقیقی اور تخلیقی

صلاحیتیں بدرجہ اُتم موجود ہوتی ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حال ہی میں ہنگری کے دو افراد کو نوبل انعام دیا گیا۔ ایک تو Katalin Kariko اور دوسرا Ferenc Krausz کو جس نے Attosecond Light Pulses سے جوہری سالمات کو دیکھنے کی ٹیکنالوجی دریافت کی۔اس جدید سائنس سے ایک نئے شعبۂ سائنس کی ابتدا ہوگی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی مادری زبان میں تحقیقی وتخلیقی صلاحیت ہوتی ہے۔ہم نے اپنی ترقی یافتہ زبان اردو کا خود ہی گلا گھونٹ دیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اپنی ترقی کا دروازہ خود ہی بند کر دیا۔ کاش ہم نے اس کو تحقیقی اور تجرباتی سائنس کا حصہ بنا دیا ہوتا تو آج کئی دریافتیں اور ایجادات اردو کا حصہ ہوتیں۔ اردو کے سائنسی اصطلاحات یورپ والے استعمال کرتے۔ ہماری اپنی زبان سے احساسِ کمتری نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھّا۔ ہمارے جامعات کا بھی یہی حال ہے۔ ویسے ہی برائے نام اردو جامعات ہیں۔ درس وتدریس وہی اِنڈلِش میں ہوتی ہے۔ہاں آپ نے صحیح پڑھا انڈیا کی انگلش (اِنڈلِش)۔نہ تو ہم انگریزی ہی ڈھنگ کی بول سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی مادری زبان اردو پر عبور ہے۔ ہاں اردو کو رومن میں لکھنا ضرور سیکھ گئے ہیں۔اردو الفاظ کا وہ حشر ہو رہا ہے کہ خدا ہی خیر کرے۔ناموں کا کچومر بن رہا ہے۔خواجہ کھاجا ہو گئے۔دواخانہ دوا کھانا ہو گیا ہے۔ان الفاظ کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس پر پی ایچ ڈی کی جاسکتی ہے۔دل کہہ رہا ہے قلم کی بے چینی کو برقرار رکھتے ہوئے دل کی ساری بھڑاس الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک تقریباً تمام مدارس انگلش میڈیم کے ہو گئے ہیں۔جامعہ علیگڑھ میں داخلے کی شرط اردو کا ایک امتحان ہوا کرتا تھا جسمیں کامیاب ہونا ضروری تھا۔فی الحال وہ شرط بھی نہیں رہی۔اب تو نام مسلم بھی اس یونیورسٹی سے نکالنے کی سازش ہو رہی ہے۔کیا عجب ہے ایسا ہو بھی جائے۔آج بھی ایسے ایسے اردو داں اشخاص موجود ہیں جن کی اردو پڑھ کر اور سُن کر مجھ جیسے ادنیٰ اردو کے طالبِ علم کو رشک آتا ہے۔اب تو آنکھیں اور کان ترستے ہیں ایسی اردو سننے کیلئے۔شاید یہ اردو کی آخری نسل ہے۔اکبر الہ آبادی نے علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلق سے ایک پیشین گوئی کی تھی۔

ابتدا کی جناب سیّد نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا اب کام تمام ہوا

سرسید احمد خاں انگریزی کے تو حامی تھے لیکن اردو کے ہرگز مخالف نہیں تھے۔ان کی کوششوں سے دیکھتے ہی دیکھتے مغربی ادب سے سائنس اور دیگر علوم کا بہت سا سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہو گیا۔سرسیّد احمد خان نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بڑے زور وشور سے اردو زبان کی مدافعت جاری رکھی۔اکبر الہ آبادی کی زبان سے ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو جسمیں اُنہوں نے سرسید احمد خاں کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے نہ بھولو فرق جو کہنے والے اور کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو کہتا ہوں یہ اکبر خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

میں نے تنقید تو بہت کر دی، لیکن اس کا آخر حل کیا ہے؟ یہاں میں خود اپنی مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ میری تعلیم مدرسۂ فوقانیہ (ہائی اسکول) تک اردو میں ہوئی۔ میری سائنس سے دلچسپی مادری زبان اردو کی وجہ سے رہی۔ یہی نہیں بلکہ سائنس سے لگاؤ اتنا شدت سے رہا کہ آٹھویں اور نویں جماعت میں سائنس میں شاعری بھی کی۔ یہ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ اگر ہم مستقبل میں اپنی نسلوں کو سائنسی دُنیا میں ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے بچوں کو مادری زبان اردو میں تعلیم دلوائیں۔ اس سے اردو کی بقاء کا مسلہ بھی حل ہوجائیگا اور ہماری دینی وعصری تعلیم خصوصاً سائنسی تعلیم میں پسماندگی بھی دور ہوجائیگی اور ہماری آنے والی نسلوں میں اچھی خاصی انگریزی خواندگی بھی برقرار رہے گی۔ آپ کہیں گے وہ کیسے؟ فکر نہ کریں ایک مضمون انگریزی کا ضرور تعلیمی نصاب میں رکھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کی وجہ سے طلبہ اچھی انگریزی لکھ بول سکیں گے۔ ویسے اردو کا گہرا تعلق عربی اور فارسی کے ساتھ ہے تو ان زبانوں کو سیکھنا بھی آسان ہوجائیگا۔ یہی سائنسی تحقیق کہتی ہے۔

اس مضمون نویسی کے درمیان میں مراکش (Morocco) سفر پر ہوں۔ فی الحال یہاں کی قومی زبان عربی کر دی گئی ہے۔ فرانس نے اس ملک کو ۴۴ رسال تک اپنا نوآبادیاتی علاقہ بنائے رکھا۔ یعنی ۴۴ رسال تک یہ ملک فرانس کی غلامی میں رہا۔ ۱۹۵۶ء میں اس کو آزادی ملی۔ یہاں کے بادشاہ کو مکمل اختیارات دے دیے گئے۔ یورپ والے چاہیں فرنچ ہوں یا برٹش، یہ جس کسی ملک پر قبضہ کرتے ہیں وہاں نوآبادیاتی نظام قائم کر دیتے ہیں۔ اپنی زبان کو مسلط کرتے ہیں تا کہ اُن کی تہذیب وتمدن، اور دین اُس ملک کا حصہ بن جائے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اُس ملک سے نکل بھی جائیں تو اُن کا اثر ورسوخ قائم رہے۔ یہی کچھ مراکش میں ہوا۔ جس طرح برطانوی راج میں انگریزی اسکول قائم ہوئے اُسی طرح یہاں فرنچ اسکول قائم ہوئے۔ فرانس کے زیر اثر جو ممالک رہے اُن میں مراکش، ماریطانیہ، سینیگل، نائجیریا، الجیریا، مدغاسکر، کیمرون، فرنچ مصر، فرنچ سوڈان اور کانگو ان کی چند مثالیں ہیں۔

صرف شعر وشاعری اور افسانہ نگاری سے زبانیں ترقی نہیں کرتیں۔ جو زبانیں سائنسی تحقیق وتخلیق کو گلے لگاتی ہیں وہ امر ہوجاتی ہیں جس کے نتیجے میں اُن کا لسانی ادب بھی عروج پاتا ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب عربی زبان سائنس کی زبان ہوا کرتی تھی جب یورپ والے جہالت کے اندھیروں میں گھرے ہوئے تھے۔ ایسے وقت اُن میں شعور جاگا۔ اُنہوں نے اپنی لاطینی زبان کو سائنس کی زبان بنادیا۔ جب تک ہم مادری زبان کو اہمیت دیتے ہوئے سائنس میں تحقیقی ترقی نہ کرینگے ہم دنیا کی امامت کے قابل نہیں ہوں گے۔ آخر میں میں یہی کہوں گا۔ فرنگیت نے ہماری نسلیں درنسلیں غلامانہ ذہنیت سے پُر کر دی ہیں۔ وہ ہم پر دن رات ظلم ڈھاتے ہیں ہمارا قتلِ عام ہوتا ہے اور ہم خاموش رہتے ہیں۔ ایک لفظ بھی اُنکی تہذیب اور اُن کی فرعونیت کے خلاف نہیں نکلتا؛ بلکہ ہم دن رات اُن کے رنگ میں رنگے جارہے ہیں۔ حالانکہ سورۃ المائدہ کی یہ آیت توجہ طلب ہے۔ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اَوْلِیَآءَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ

الظّٰلِمِیْنَ ۔(۵۱) اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ تو آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے گا وہ بے شک انہی میں سے ہے، ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز راہِ راست نہیں دکھاتا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

سُنا ہے مَیں نے، غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے

اگر ہم کو اس غلامی سے نجات حاصل کرنا ہے تو فرنگی زبان اور فرنگیت کے نرغے سے نکلنا ہوگا۔ خودی کی پرورش کرنی ہوگی۔ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے دین کی حفاظت کرنی ہوگی۔ خود کو خوداختیار اور خودمختار بنانا ہوگا۔ جب ہم عالمِ ایجاد میں صاحبِ ایجاد بن جائینگے تو سارا عالم ہمارے گرد طواف کرے گا۔

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد — ہر دَور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو — کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اُس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک! — ہے جس کے تصوّر میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید — مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

ہمیں ایک تحریک چلانی ہوگی۔ والدین کو بچوں کی مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو واضح کرنا ہوگا اور ساتھ ہی جستجو اور کھوج سے سائنسی تحقیق کو فروغ دینا ہوگا۔ آپ کو یہ جان کر خاصہ تعجب ہوگا دنیا میں ہونے والی سائنسی تحقیق پر ہونے والے کل مصارف میں اسلامی دنیا کا حصہ صرف ایک فی صد ہے۔ بس ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں غیر اقوام کی تحقیق شدہ سائنس پر کتابیں لکھ سکتے ہیں، رسالے نکال سکتے ہیں، اور مقالے شائع کر سکتے ہیں لیکن خود سے تحقیق کرنا ہمارے لئے محال یا یوں کہئے ہمارے بس کی بات نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِيْ السَّمَاوَاتِ وَمَا فِيْ الْأَرْضِ جَمِيْعاً مِّنْهُ إِنَّ فِيْ ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (سورۂ جاثیہ: ۱۳) ''اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور فکر کرنے والے ہیں''۔

آہ! کیا کہوں لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے ہماری زبان، تہذیب اور دین کو فرنگی زبان اور تہذیب نے یرغمال کرلیا ہے۔ اسی طرح مراکش میں مسلمان فرانسیسی زبان کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ اپنے بچوں کو فرانسیسی میڈیم کے مدارس میں تعلیم دلواتے ہیں۔ میں نے ڈنکے کی چوٹ پر ان کو کہہ دیا ہے کہ اگر دُنیا و آخرت میں اپنا مقام پیدا کرنا ہے تو اپنی مادری زبان عربی میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی جائے۔ تعلیمیافتہ ہونے سے مراد کسی بیرونی ملک کی زبان کا جاننا نہیں ہے۔ تعلیمیافتہ ہونے سے مراد اپنی خودی کی پرورش اور اندازِ غلامانہ کی نفی ہے۔ ہم نے اپنی عقل کو یورپی تہذیب کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔

جاں بھی گرِو غیر، بدن بھی گرِو غیر — افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تُو — مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

مقالات و مضامین:

اسلام اور تعلیمِ نسواں

محمد عرفات اعجاز اعظمی

کہا جاتا ہے کہ انسان کی پہلی درس گاہ اور تربیت گاہ عورت کی گود ہوتی ہے۔ تہذیب و شرافت کی خشتِ اول یہیں رکھی جاتی ہے، اسی خشت اول کے سہارے انسان کی شخصیت کی تعمیر و تزئین ہوتی رہتی ہے۔ اگر خشت اول درست رکھی گئی تو عمارت کی اٹھان درست نہج پر ہوگی اور اگر خشت اول ہی کج ہوگئی تو شخصیت کی پوری عمارت کج و بے راہ رو ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیاد سے زیادہ انسانی زندگی کے معاملہ بنیاد گزار کی اہمیت ہے۔ پہلے بنیاد گزار کو مہذب و شائستہ بنانا ضروری ہے، تاکہ بنیاد کی خشت اول کجی و بے راہ روی سے محفوظ رہے۔

اسلام نے اور پیغمبر اسلام نے اس سمت میں پہلے ہی روز سے توجہ دی ہے اور اس کا مستحکم انتظام کیا ہے۔ تہذیب و تربیت کے لیے بنیادی چیز تعلیم ہے۔ یعنی تعلیم ہی وہ جوہر ہے جس کے سہارے شرافت و نجابت کی بنیاد مضبوط اور عمارت مستحکم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: **طلب العلم فریضة علی کل مسلم**۔ [مشکوۃ: ۲۱۸] علم حاصل کرنا ہر مسلمان [مرد ہو یا عورت] کے لیے لازم ہے۔

مرد کی تعلیم کا مسئلہ تو بالکل واضح ہے مگر عورتوں کی تعلیم کی راہ صنفی نزاکتوں کی وجہ سے ذرا مشکل بھری ہے۔ اسی لیے یہ مسئلہ پیچیدگی کی وجہ سے بہت ہی زیادہ قابل توجہ ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالی نے پہلی وحی میں 'اقرا' یعنی پڑھنے کا حکم دیا ہے، یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ سے پوری امت کے لیے ہے۔ اس میں نہ صنف کی قید ہے اور نہ ہی کسی کی تخصیص ہے۔ محض یہی حکم عورتوں کی تعلیم کے لیے کافی تھا، مگر اللہ نے خاص اہتمام سے قرآن میں ایک جگہ امہات المومنین کے واسطہ سے امت کی تمام عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے: **واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ و الحکمة**۔ [احزاب: ۳۴] اللہ کی ان آیتوں اور حکمتوں کو تم یاد کرو جس کی تلاوت تمھارے گھروں میں کی جاتی ہے۔ یعنی قرآن کے معانی و مفاہیم کو سیکھو اور اس کی حکمتوں کو سمجھو۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سے زاید احادیث میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے لوگوں کو ابھارا ہے اور ان کی بہترین تربیت پر بڑے اجر کی بشارت دی ہے۔ آپ کا فرمان ہے کہ: **من عال ثلاث بنات فادبھن و زوجھن و احسن الیھن فلہ الجنة**۔ [ابوداؤد: ۵۲۴۷] جس شخص نے تین بچیوں کی کفالت کی، انھیں ادب، تمیز و تہذیب سکھائی، ان کی شادی کردی، ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: **ثلاثة لھم اجران: رجل من اھل الکتاب**

آمن بنبیہ و آمن بمحمد، و العبد المملوک اذا ادّی حق اللہ و حق موالیہ، و رجل لہ اَمَۃٌ فادبھا فاحسن تادیبھا و علمھا فاحسن تعلیمھا ثم اعتقھا فتزوجھا فلہ اجران۔ [صحیح بخاری، کتاب العلم] تین طرح کے لوگوں کے لیے دوہرا اجر ہے: ایک وہ اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لائے اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ دوسرے وہ غلام جو اللہ اور اپنے مالک کا حق ادا کرے اور تیسرے وہ شخص جس کے پاس باندی ہو اور وہ اس کو بہترین تعلیم اور بہترین ادب سے آراستہ کرے اور پھر اس کو آزاد کر کے اس کا نکاح کر دے۔

اس حدیث کے آخری جز یعنی باندی کو بہترین تعلیم و تادیب کے تعلق سے ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ 'یہ حکم صرف باندی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس بشارت میں اپنی اولاد اور عام لڑکیاں بھی شامل ہیں۔' [مرقات: ج ا ص: ۷۹] یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کے لیے حسن تعلیم اور حسن ادب کا انتظام کرتا ہے تو وہ اس حدیث کا مصداق ہوگا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اگر کوئی کسی بھی مسلمان لڑکی کے لیے حسن تعلیم و حسن تادیب کا ذریعہ بنتا ہے تو وہ بھی اس حدیث کے مصداق میں شامل ہوگا اور دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کا حکم صرف مردوں تک نہیں رکھا ہے بلکہ عورتوں کو بھی حکم دیا ہے کہ جس کے پاس جو علم یا فن ہو وہ دوسروں کو سکھلائے۔ حضرت شفا بنت عدویہ ایک تعلیم یافتہ صحابیہ ہیں۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ 'صفیہ کو جیسے تم نے نملہ [پھوڑے] کا رُقیہ سکھلایا ہے اسی طرح اسے لکھنا پڑھنا بھی سکھا دو۔ [فتوح البلدان، بلاذری: ج ۱ ۴۵۸]

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی تعلیم کا اس قدر اہتمام فرمایا ہے کہ ان کی صنفی نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی تعلیم و تہذیب کے لیے باقاعدہ ایک دن متعین فرمایا۔ حضرت ابوسعید خذری کی روایت ہے: **قالت النساء للنبی صلی اللہ علیہ وسلم: غلبن علیک الرجال، فاجعل لنا یوماً من نفسک، فوعدھن یوماً لقیھن فیہ فوعظھن و امرھن۔** عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے لیے بھی ایک دن متعین فرما دیجیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک دن کا وعدہ کر لیا جس میں آپ ان کو نصیحت کرتے اور اچھے کاموں کا حکم دیتے۔ [صحیح بخاری، کتاب العلم]

کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس عورتوں کے مجمع میں ان کی تعلیم کی غرض سے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت بلال کو ساتھ لے کر عورتوں کے مجمع میں تشریف لے گئے اور ان کو نصیحت کی اور صدقہ کی ترغیب دی۔ [صحیح بخاری: ج ا ص ۲۰]

سنن دارمی کی روایت ہے کہ عورتوں کی تعلیم کے تعلق سے مردوں کو حکم دیتے ہوئے سورہ بقرہ کی آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'تم خود بھی ان کو سیکھو اور اپنی خواتین کو بھی سکھلاؤ۔' [۹۳۳] اسی طرح بعض وفود کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ 'تم اپنے گھروں میں واپس جاؤ، اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہو، ان کو دین کی

تعلیم دواوران سے احکام دینی پر عمل کراؤ۔'[صحیح بخاری:۳۶]

اسی طرح المعجم الکبیر للطبرانی کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'جو شخص اپنی بیٹی کی خوب اچھی طرح سے تعلیم وتربیت کرے اور اس پر دل کھول کر خرچ کرے تو بیٹی اس کے لیے جہنم سے نجات کا ذریعہ ہوگی۔'[۱۰۴۴۷]

ان احادیث وآثار سے بخوبی اندازہ کیا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں عورتوں کی تعلیم وتہذیب کی کیا اہمیت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس صنف کی آراستگی وشائستگی کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی اور لوگوں کو اس کی ترغیب دلائی۔ آپ کے بعد خلفاے راشدین کے دور میں بھی یہ سلسلہ اسی اہتمام سے چلتا رہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی سلطنت کے ہر حصہ میں یہ اعلان عام کرا رکھا تھا کہ: علموا نساءکم سورۃ النور۔ اپنی عورتوں کو سورہ نور کی تعلیم ضرور دو۔[الدر المنثور: ج۵ ص۸۱]

خصوصیت کے ساتھ سورہ نور کا ذکر اس لیے کیا کہ اس سورت میں پردہ اور خانگی ومعاشرتی زندگی سے متعلق بہت سے اہم مسائل ہیں جن سے عورتوں کا روز کا واسطہ ہے۔

اسی اہتمام اور توجہ کا اثر تھا کہ دور اول میں ایسی باصلاحیت اور صاحب علم خواتین گزری ہیں جو مردوں کے لیے قابل رشک تھیں۔ ان میں سر فہرست ازواج مطہرات ہیں۔ حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ کی ذہانت و ذکاوت اور ان کی حدیثی وفقہی خدمات سے کون پڑھا لکھا شخص ناواقف ہوگا۔ یہ جیسے ام المومنین ہیں ویسے ہی ام العلوم بھی ہیں۔

حضرت ام سلمہ کی صاحبزادی جو رسول اللہ ﷺ کی پروردہ بھی ہیں، حضرت زینب بنت ابوسلمہ، ان کے بارے میں علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں لکھا ہے کہ: **کانت افقه نساء اهل زمانها** ۔[ج۲،ص۷۲۴] وہ اپنے زمانے میں عورتوں میں سب سے بڑی فقیہ تھیں۔ حضرت سمرہ بنت نہیک اسدیہ کے بارے میں ہے کہ 'وہ زبردست عالمہ تھیں، لمبی عمر پائی، ان کے علم وفضل کی دھاک کا یہ عالم تھا کہ بازاروں میں جا کر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتیں اور بے راہ رووں کی بسا اوقات کوڑوں سے خبر لیتیں۔'[الاستیعاب ابن عبدالبر: ج۲ ص۷۴۰]

ان کے علاوہ سیکڑوں صحابیات ہیں جنھوں نے علوم نبوت کو امت تک روایتوں کے ذریعے منتقل کیا۔ اس کا ایک سرسری اندازہ محض اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام احمد حنبل میں ۱۴۰ر سے زاید عالم صحابیات کا تذکرہ لکھا ہے۔ **اسد الغابه اور الاصابه فی تمییز الصحابه** میں ۵۰۰ر سے زاید عالم صحابیات کے تذکرے موجود ہیں۔ **تهذیب التهذیب** میں ۲۳۳ر بنات اسلام کا ذکر ہے جن میں بیشتر صحابی ہیں۔

یہ اعداد وشمار اس بات کی دلیل ہیں کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں عورتوں کی تعلیم کی جانب کس قدر توجہ تھی

اوراسی بھرپورتوجہ کانتیجہ ہے کہ ذخیرہ احادیث کاایک معتد بہ حصہ عورتوں کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔

صحابیات کے بعدان کی شاگردہ تابعیات نے بھی میدان علم میں اسی جوش وجذبہ کے ساتھ قدم رکھااورتحمل حدیث وروایت میں پیہم مصروف رہیں اور دینی علوم کوآگے بڑھایا۔چنانچہ تقریب التہذیب میں تقریباً ۱۲۱- تابعیات کے تراجم موجود ہیں جومیدانِ علمِ حدیث میں ان کی فعال موجودگی کی بین دلیل ہے۔

تابعیات کے بعد تبع تابعیات اوران کی شاگردوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔علما ومحدثین کی طرح عالمات ومحدثات کی بھی ایک لمبی فہرست ہے اورجس طرح علما ومحدثین اور فقہا ومتکلمین بڑے اور اونچے علمی القاب وخطابات سے نوازے گئے،اسی طرح عالمات ومحدثات بھی اُن بلند خطابات کی اپنی تحقیق وجستجو کی بنا پر مستحق قرار پائی ہیں۔ذیل میں ان چند عالماتِ اسلام کے القاب مختصراً درج کیے جاتے ہیں جنھیں بجاطور پر اقلیم علم کی ملکہ کہا جاسکتا ہےاوران کی بلند قامتی سے عورتوں کی دینی قیادت وامامت کاایقان حاصل کیاجاسکتا ہے:

ست الاجناس:	موقفیہ بنت عبدالوہاب بن عتیق بن وردان مصریہ
ست الاہل:	ام احمد بنت علوان بن سعد بعلبکیہ
ست الشام:	خاتون اخت الملک العادل
ست العرب:	ام الخیر بنت یحییٰ بن قائماز کندیہ دمشقیہ
ست الفقہاء:	شریفہ بنت خطیب شرف الدین احمد بن محمد دمشقیہ
ست الکل:	عائشہ بنت محمد بن احمد بن علی قلیسہ
ست الکل:	بنت امام رضی الدین ابراہیم بن محمد طبریہ مکیہ
ست الملوک:	فاطمہ بنت علی بن علی بن ابوبدر بغدادیہ
ست الناس:	کمالیہ بنت احمد بن عبدالقادر دمرادیہ
ست الوزراء:	بنت عمر بن اسعد تنوخیہ
تاج النساء:	بنت رستم بن ابورجاء بن محمد اصفہانیہ
شرف النساء:	امۃ اللہ بنت احمد بن عبداللہ بن علی بنو آسیہ
فخر النساء:	شہدہ بنت احمد بن عمر ابریہ بغدادیہ
زین الدار:	وجیہہ بنت علی بن یحییٰ انصاریہ بوصیریہ
شجرۃ الدُّر:	ام خلیل
حرہ:	ام المویدزینب بنت ابوالقاسم عبدالرحمان شعریہ نیساپوریہ
جلیلہ:	ام عمر خدیجہ بنت عمر بن احمد بن عدیم
معلمہ:	غالیمہ بنت محمد اندلسیہ
شیخہ:	ام عبداللہ حبیبہ بنت خطیب عزالدین ابراہیم مقدسیہ
شیخہ:	ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ
شیخہ:	ام الفضل صفیہ بنت ابراہیم بن احمد مکیہ
شیخہ:	ام احمد زینب بنت مکی بن علی کاملیہ

ان خطابات میں جہاں 'ست' کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں مراد 'سیدہ' ہے۔ [خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات: قاضی اطہر مبارک پوری: ص ۳۸]

ان کے علاوہ بہت سی ایسی محدثات گزری ہیں جو بڑے بلند پایہ کی عالمہ و فاضلہ تھیں، اسنادِ حدیث میں ایسا عالی مقام رکھتی تھیں کہ علما و محدثین نے ان سے سند لی۔ چند ایک مسندات کے نام یہ ہیں:

ام محمد اسماء بنت محمد سالم بن ابو مواہب، ام محمد فاطمہ بنت ابراہیم بن محمود بعلیہ [مسندۃ الشام] ام عبداللہ زینب بنت احمد بن عبدالرحیم قدسیہ [مسندۃ الشام] کریمہ بنت عبدالوہاب ابن علی بن خضر قرشیہ زبیریہ [مسندۃ مکہ] فاطمہ بنت احمد بن قاسم حرازیہ [مسندۃ الوقت] ست الوزراء بنت عمر بن اسعد بن منجا تنوخیہ۔

یہ محض نمونے کے چند مسندات و محدثات کے نام و القاب کا ذکر کر دیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بناتِ اسلام کی علمی خدمات علم کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، اسمائے رجال، زبان و ادب، شعر و شاعری، غرض ہر میدان میں بناتِ اسلام کے واضح نقوشِ پا ملتے ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر محمد اکرم ندوی جون پوری نے 'محدثات' کے نام سے اپنی کتاب چالیس جلدوں میں مکمل کی ہے جس میں ۸۰۰۰/ ہزار سے زاید محدثات کے تراجم ہیں۔ علم کے مختلف میدان میں بناتِ اسلام کی خدمات کو جاننے کے لیے قاضی اطہر صاحب کی کتاب 'خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات' کا مطالعہ مفید ہوگا۔ قاضی صاحب نے خواتین اسلام کے کسب علم اور تعلیم و تدریس کے طریقوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان کے اسفارِ علمیہ کا بھی ذکر کیا ہے، اور ایک لمبی فہرست مختلف میدانِ علم میں کارنامے انجام دینے والی خواتین کی درج کی ہے۔

یہ تو مختصر ذکر ہوا بناتِ اسلام کے تئیں اسلام اور اہل اسلام کی حوصلہ افزائیوں کا، لیکن اس کے برعکس اگر بنات اسلام کو- جن کی گود انسان کی پہلی تعلیم و تربیت گاہ ہے- زیور تعلیم و تہذیب سے محروم رکھا جائے تو یہ ایسا ہی ہے کہ کسی انسان کی شخصیت کی تعمیر کے لیے بنیاد کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دی جائے، اور ظاہر ہے کہ جب پہلی اینٹ ہی کج ہوگی تو پوری شخصیت کی تعمیر میں یہ کجی باقی رہے گی، اور اسی کجی سے آئندہ نسلوں کو بے راہ روی، ذہنی و علمی افلاس، علمی و علمی ارتداد اور نہ جانے کتنے مفاسد کو غذا ملتی رہے گی۔ اس لیے نسلوں کو اگر سنوارنا ہے تو بنیاد گزار کو زیرک و مضبوط بنانا ضروری ہے اور اس کا واحد راستہ ان کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ بنات کی تعلیم کا راستہ خاصا مشکل بھرا راستہ ہے، اس کے لیے وہی راستہ اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو دور اول سے متوارث ہے۔ دور جدید کی جو اختلاطی لعنتیں ہیں ان سے کلیتاً احتراز ضروری ہے، ورنہ معاملہ بالکل الٹا اور نتیجہ بالکل برعکس ہو جائے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے: **لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا**۔ اس امت کے آخری لوگ انھیں چیزوں سے درست ہو سکتے ہیں جن سے پہلے ہوئے ہیں۔

مقالات و مضامین:

گلدستہ حیات کی مہکار ''ماں'' اور مدر ڈے کی حیثیت

ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی
آراضی باغ، اعظم گڑھ

قدرت کا عطا کردہ گلدستہ حیات متنوع رشتوں سے مالا مال ہے جس کی مہکار اس ماں سے ہے جو اپنی دبیز خوشبو کے تار و پود بکھیرتی ہے تو پھیلتی چلی جاتی ہے۔ ماں محبت کا وہ حقیقی پیکر ہے جس کی گود دنیا کی محفوظ ترین جگہ ہوتی ہے۔ وہ انمول متاع حیات جس کی محبت کا نقشہ اس صورت میں ابھرتا ہے کہ بی بی ھاجرہ کا اسماعیل کے لئے تڑپ تڑپ کر پانی تلاش کرنا اور صفا و مروہ کے پتھریلے پہاڑ کے چکر لگانا اور پھر دریائے رحمت کا جوش میں آنا اور زمزم کا امڈتا چشمہ پھوٹ پڑنا یہ ماں کا وہ عظیم کردار ہی ہے جو رب ذوالجلال کو اس قدر پسند آتا ہے کہ اسے اسلام کے پانچویں رکن حج اور عمرہ کا مستقل رکن بنا دیتا ہے۔

ماں کی وہ ممتا ہی ہے جو فرعون کے دربار میں پلتے شیر خوار کے لئے جب تڑپتی ہے تو رحمت الٰہی اس کی تربیت کا بندوبست کر دیتی ہے اور رب کریم اس عظیم شاہکار کا نقشہ موسیٰ کی ماں کے نام سے نہایت حسین پیرایہ میں پیش کر کے قرآن کی زینت بنا دیتا ہے۔ ماں حقیقی محبت کا وہ پیکر ہی ہے کہ جب اس کی عظمت و حقوق کی بات آتی ہے تو اویس قرنی جیسے جلیل القدر تابعی کو شرف صحابیت سے محروم کر دیتی ہے لیکن محبت کے اس پیکر کا جواب خدمت کی شکل میں دینے پر اس شخصیت کو مستجاب الدعوات بنا دیتی ہے۔

دنیا کے نشیب و فراز سمجھانے والی اپنی راتوں کی نیند، اپنی چھوٹی بڑی خواہشیں قربان کر کے خوش ہونے والی اور بڑی آسانی سے بغیر احسان جتائے اپنی اولاد کو زندگی سے ملانے والی ماں کی قربانیوں کا ذکر رب کریم " **حملته کرھا و وضعته کرھا** " کے انداز میں پیش کرتا ہے تو فرش تا عرش اس کی عظمت کا اعتراف ہونے لگتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں عمر رسیدہ اَفراد اور بالخصوص والدین کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے اس کا اندازہ رب ذوالجلال کے اس کلام سے لگایا جا سکتا ہے جو اپنی الوہیت کے ذکر کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتا ہے اور ان کے ساتھ بدسلوکی کو گناہ کبیرہ قرار دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَضَى رَبُّكَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَآ أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيمًا O وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا O (بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۳، ۲۴)

''اور آپ کے رب نے حکم فرما دیا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ

سلوک کیا کرو، اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں ''اُف'' بھی نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان دونوں کے ساتھ بڑے ادب سے بات کیا کرو اور ان دونوں کے لیے نرم دلی سے عجز و انکساری کے بازو جھکائے رکھو اور (اللہ کے حضور) عرض کرتے رہو: اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے (رحمت وشفقت سے) پالا تھا''

والدین اور بالخصوص ماں کی عظمت کا اعتراف نبیٔ کائنات کی زبان مبارک سے جب ہوتا ہے تو انسانوں میں سب سے پہلا تین گنا حق ماں کا قرار پاتا ہے اور اس کے بعد والد اس حقوق کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! لوگوں میں حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا: تمہاری والدہ۔ انہوں نے عرض کیا: پھر کون ہے؟ فرمایا: تمہاری والدہ۔ انہوں نے عرض کیا: پھر کون ہے؟ فرمایا: تمہاری والدہ۔ انہوں نے عرض کیا: پھر کون ہے؟ فرمایا: پھر تمہارا والد ہے۔ (متفق علیہ)

اور رہا باپ کا حق تو رضائے الٰہی ہی اس سے مربوط ہے۔ ارشاد نبوی ہے: **عن عبداللہ بن عمرو، عن النبي ﷺ قال: "رضا الرب في رضا الوالد، وسخط الرب في سخط الوالد"**۔ (سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۱۹۰۰) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''رب کی رضا والد کی رضا میں ہے اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔ نیز نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: **ما أكرم شاب شيخا لسنه إلا قيض الله له من يكرمه عند سنه.** ''جو جوان کسی بوڑھے کی عمر رسیدگی کے باعث اس کی عزت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس جوان کے لیے کسی کو مقرر فرما دیتا ہے جو اس کے بڑھاپے میں اس کی عزت کرے گا''۔ (ترمذي، رقم: ۳۷۲)

غرض یہ کہ اسلام میں والدین کا ایک واضح تصور موجود ہے لیکن مغرب کی اندھا دھند تقلید میں آج اسلامی معاشرہ بھی ان بے جا اور ناقابل قبول رسومات کی ادائیگی میں مصروف عمل نظر آتا ہے جسے ہم مدرز ڈے یا فادرز ڈے سے جانتے ہیں جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر لمحہ اولاد کی توجہ حاصل کرنے کے حقدار ماں باپ محض ایک دن سرخ پھولوں کا گلدستہ لے کر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائیں۔

تاریخی اعتبار سے اگر مدرز ڈے کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واہوتی ہے کہ اس دن کا آغاز سن ۱۸۷۰ء میں ہوا جب جولیا وارڈ نامی عورت نے اپنی ماں کی یاد میں اس دن کو شروع کیا۔ جولیا وارڈ اپنے عہد کی ایک ممتاز مصلح، شاعرہ، انسانی حقوق کی کارکن اور سوشل ورکر تھیں۔ بعد ازاں ۱۸۷۷ء کو امریکہ میں پہلا مدرز ڈے منایا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں امریکی ریاست فلاڈیفیا میں اینا ایم جاروس نامی اسکول ٹیچر نے باقاعدہ طور پر اس دن کو منانے کی رسم کا آغاز کیا۔ اس نے اپنی ماں این ماریا ریویس کی یاد میں یہ دن منانے کی تحریک کو قومی سطح پر اجاگر کیا یوں ان کی ماں کی یاد میں باقاعدہ طور پر امریکہ میں اس دن کا آغاز ہوا۔ یہ تقریب امریکہ کے ایک چرچ میں ہوئی۔ اس موقع پر اس نے اپنی ماں کے پسندیدہ پھول تقریب میں پیش کیے۔ اس تحریک پر اس وقت کے امریکی صدر وڈرولسن

نے ماؤں کے احترام میں مئی کے دوسرے اتوار کو قومی دن کے طور پر منانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد یہ دن ہر سال مئی کے دوسرے اتوار کو منایا جاتا ہے۔ اس مناسبت سے برطانیہ میں اس دن کو Mothering Sunday بھی کہا جاتا ہے۔ (ایم ایس پاکستانی، www.minhaj.org)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں سال بھر والدین سے غافل رہنے والی اور اپنے والدین کو اولڈ ہومز میں رکھنے والی اولاد اس روز بیش قیمت تحفے تحائف کے ساتھ اپنی ماؤں سے ملاقات کر کے اپنی محبت وعقیدت کا نذرانہ پیش کرتی ہے اور اپنی زندہ ماں کے لئے سرخ پھولوں اور مردہ ماں کے لئے سفید پھولوں کا گلدستہ ان کی قبروں پر چڑھا کر خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھتی ہے اور زندگی کا سب سے پہلا سبق سکھانے والے استاد کے حقوق کو فراموش کر دیتی ہے۔۔ ہر ملک میں مدر ڈے کو منانے کے لیے مختلف دن مختص ہیں تاہم امریکہ، ڈنمارک، فن لینڈ، ترکی، اسٹریلیا اور بیلجیم میں یہ دن مئی کے دوسرے اتوار کو ہی منایا جاتا ہے۔

مگر قربان جایئے اللہ کے حبیب ﷺ پر کہ جس کے دین میں ماں باپ کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ وہ گھروں کے تاحیات سربراہ ہوا کرتے ہیں جن کی معزولی کا کوئی تصور موجود نہیں۔ وہ انمول تحفہ جس کی خدمت جنت کا حقدار بناتی ہے اور رب کریم کی رضا کو واجب کرتی ہے مگر افسوس کہ مغرب کی تقلید نے آج اسلامی معاشرہ کو بھی ایک مہلک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں جنریشن زی اپنے والدین کو اولڈ ہومز میں رکھنے کی جانب گامزن ہے۔

لیکن ہم غور کریں کہ کسی خاص موقع کی طرح رمائنڈر میں سیٹ کر کے اسے اس کے خاص ہونے کا احساس دلانا جس نے ہمیں دنیا میں سب سے خاص سمجھا'' کیا ٹھیک ہے؟ حیات انسانی میں سے عظیم ہستی کا ٹائٹل حاصل کرنے والی شخصیت کے لئے محض ایک دن خاص کر دینا کیا یہ شخصیت اور انسانیت کا قتل نہیں ہے؟

یہی وہ سوالات ہیں جو یقینا آج بھی جواب کے متلاشی ہیں۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام میں تو ہر لمحہ اور ہر دن مدر ڈے اور فادر ڈے ہے۔ کسی شاعر کے مدرز ڈے کے رد میں پیش کردہ نظم کے یہ چند اشعار جو چیخ چیخ کر ماں کی عظمت اور حقوق کی ترجمانی کرتے ہیں:

کہد و فلک سے، اپنے اجالے سمیٹ لے — روشن، ہماری ذات کا مینار ماں سے ہے
کرتی ہے وہ، زمیں کے ستاروں کی پرورش — اے آسمان ! تو بھی ضیابار ماں سے ہے
مخصوص کیسے ہوگا * مدرڈے * میں ایک دن — یہ وقت ،، یہ زمانہ ،، یہ سنسار، ماں سے ہے
اُس ذات کو نہ قید کرو ، ماہ و سال میں — سورج ہر اک زمانے کو، درکار ماں سے ہے
رُک جائیں وہ قدم، تو ٹھہر جائے کائنات — سن لیجیے ! کہ وقت کی رفتار ماں سے ہے

ماخوذ من فریدی مصباحی، ۱۴/مئی ۲۰۱۹ء

کاش ہم ماں کی اس عظمت کا راز پا سکیں جو رب رحیم کے کلام میں پنہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو ماں کی عظمت سے روشناس کرے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مقالات و مضامین: **قسط اول:**

انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا شرعی حکم

نسیم ظفر بلیاوی قاسمی

تمہید:

خداوند قدوس نے اپنی تمام مخلوقات میں انسانوں کو اشرف اور اعلیٰ بنایا ہے، اسے محترم ومکرم قرار دیا اور خوبصورت وجاہت اور بہترین شکل وشباہت سے نوازا ہے، ہر موڑ اور ہر لمحہ اس کی شرافت وکرامت کا بھرپور خیال رکھا ہے، پوری مخلوقات کو اس کی خدمت کے لیے متعین فرمادیا ہے اور اس کے نہ صرف جسم کو محترم بنایا ہے، بلکہ اس کے ایک ایک عضو کو نہایت مکرم اور باوقار بنایا ہے، جس کی منظر کشی قرآن کچھ یوں کرتا ہے: **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم.** (التین: ۴) ہم نے انسان کو بہت خوب صورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

غرضیکہ شریعت اسلامیہ نے انسان کو بہترین سانچے اور دھاگے میں پرویا ہے، اور مزید انسان کے اعضاء و اجزاء کی حفاظت کے لیے کشادہ اور وسیع ترین ذرائع کا بھی انتظام فرمایا ہے اور انسانی اعضاء کی قدر ومنزلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''شریعت نے انسان کے بال اور ناخن کی کرامت وعظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو مناسب جگہ پر دفن کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو نامناسب اور نجس وناپاک جگہ پر ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔ چناں چہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ: **فإذا قلم اظفاره او جزّ شعره ينبغي أن يدفن ذلک الظفر والشعر المجزور فإن رمى به فلا بأس وان القاه في الكنيف أو في المغتسل يكره ذلک لأن ذلک يورث داء** (الفتاوی الہندیہ: ۳۵۸/۳)

اس لیے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اسلام نے انسانی زندگی کی حفاظت کو خصوصی بلکہ غیر معمولی اہمیت دی ہے، حتی کہ اضطراری حالت میں جان بچانے کے لیے حرام اشیاء کے خورد ونوش کی بھی اجازت مرحمت فرمادی ہے، چنانچہ اگر انسان کو کچھ ہوجاتا ہے، یا اس کے اجسام واعضاء میں کوئی سوزش، شدید درد، یا کسی بھی قسم کی خرابی اور بیماری پیدا ہوجاتی ہے، تو ایسے میں ''اسلام'' انسانی زندگی کی بقا وسلامتی اور اس کے تحفظ واستحکام کا ''حل'' علاج و معالجہ کی شکل میں پیش فرماتا ہے۔

اور آج چوں کہ دور حاضر میں علاج ومعالجے کے ایسے مختلف طریقے وجود پذیر ہوگئے ہیں کہ انسانی اذہان و قلوب میں وہم وگمان اور ان کا تصور بھی نہیں تھا، مگر موجودہ دور میں نئی علمی انکشافات، سائنسی تحقیقات اور موجودہ طبی

ذرائع نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر کسی انسان کا عضو ناکارہ اور عبث ہو چکا ہو، تو اس عضو کے عمل کو پھر سے اصلی حالت پر برقرار رکھنے کے لیے ایک انسان کا عضو دوسرے انسان میں کامیابی کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے، چناں چہ علاج کی اس نئی صورت سے سماج میں بہت سارے مسائل پیدا ہو گئے ہیں، مثلاً ''انسان'' اعضاء انسانی کے ساتھ غیر حیوانی اجزاء کا استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟ ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی کے جسم کے دوسری جگہ بوقتِ حاجت استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح انسان کوئی اپنا عضو اپنی زندگی میں ہبہ اور وصیت کر سکتا ہے یا نہیں؟

علاوہ ازیں کئی ایک ایسے مسائل ہیں، جو اس وقت لوگوں کو درکار اور درپیش ہیں، چناں چہ ایسے میں ضرورت ہے کہ ان امور کے بارے میں جو سوالات و اعتراضات وضاحت طلب ہیں، ان کے مدلل و مفصل جوابات دیے جائیں اور جن مسائل سے عوام ناواقف و ناشناس ہیں، یا وہ مسائل گنجلک اور دشوار ترین ہیں، ان کے بارے میں شرعی نقطہ نظر واضح کیا جائے، تاکہ ضرورت کی بنیاد پر جو سہولت فراہم ہو سکتی ہو، اس سے فائدہ اٹھانا ممکن اور آسان ہو اور جہاں جو بات دشوار ہو، یا شانِ انسانی اور شریعت کے خلاف ہو، اس سے گریز اور اجتناب کیا جائے۔

اعضاء کی پیوندکاری کا مفہوم:

اعضاء کی پیوندکاری کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو جائے، تو اس عضو کے عمل کو پھر سے جاری رکھنے کے لیے زندہ یا مردہ انسان کے اعضاء کو اس میں جوڑ دیا جائے، تاکہ اس سے بقیہ حیات گزارنے میں انسان کو آسانی اور سہولت میسر آ جائے، واضح رہے کہ تعریف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسئلہ درحقیقت زندہ یا مردہ ''انسان کے اعضاء کی پیوندکاری'' کا ہے، نہ کہ حیوانات، نباتات، معدنیات اور جمادات کے اعضاء کی پیوندکاری کا، کیوں کہ مذکورہ چیزوں کے ذریعے مریضوں اور معذوروں کے علاج و معالجہ کا سلسلہ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے، عہد صحابہ میں مصنوعی چیزوں کے استعمال کا ثبوت ملتا ہے، چناں چہ صحابیٔ رسول حضرت عرفجہ بن سعد رضی اللہ عنہ کی ناک جاہلیت کی ایک جنگ کلاب میں کٹ گئی تھی، انہوں نے چاندی کی ناک بنوا کر لگائی، اس میں بدبو پیدا ہو گئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو سونے کی ناک لگوانے کا حکم دیا۔ (سنن نسائی: ۵۱۶۵، مشکوۃ المصابیح: ۴۲۹۳) اور حالیہ طبی انکشافات اور ہوش ربا ترقیات نے اس میں اب مزید نئے نئے انکشافات برپا کر دیے ہیں، یہ نئی صورتیں دنیاوی اور اجتماعی حیثیت سے بھی مفید اور کارآمد ہیں اور دینی اعتبار سے بھی۔

حرام چیزوں سے علاج کی شرعی حیثیت:

تاہم شریعت اسلامیہ نے ان کی اجازت کے لیے کچھ معقول شرائط تجویز کر رکھی ہیں، مثلاً انسان کے لیے بوقتِ ضرورت انسانی اعضاء کے علاوہ دیگر چیزوں کے مصنوعی اعضاء کو لگانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مصنوعی اجزاء و

اعضاء حلال و پاک اشیاء سے بنے ہوں، نجس یا حرام چیزوں سے نہ بنے ہوں اور نہ ہی ان میں کسی نجس و ناپاک چیز کی آمیزش ہو؛ نیز ان کو شرعی طور پر ذبح بھی کیا گیا ہو، تاہم اگر حلال متبادل نہ ہو اور انسانی جان کی ہلاکت اور عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ اور اندیشہ ہو اور نجات کا انحصار صرف حرام جانور پر ہی ہو، تو ایسی صورت میں حرام یا نجس اشیاء سے بنے ہوئے اعضا و اجزاء کا کھانا اور استعمال کرنا جائز ہو جائے گا، بشرطیکہ کسی معتمد طبیب کے نزدیک اس کے علاوہ کوئی علاج نہ ہو اور اس سے بیماری اور تکلیف دور ہو جانے کا پورا یقین ہو، ان مذکورہ شرطوں کے ساتھ باتفاق فقہاء امت حرام چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، چناں چہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: **یجوز التداوی بالمحرم کالخمر و البول اذا اخبر طبیب مسلم ان فیہ شفاء و لم یجد غیرہ من المباح ما یقوم مقامہ و الحرمۃ ترتفع للضرورۃ فلم یکن متدوایا بالحرام.** (تبیین الحقائق: ۶/۳۳) یعنی حرام اشیاء جیسے شراب اور پیشاب سے علاج جائز ہے، بشرطیکہ کسی مسلمان طبیب نے اس میں شفاء کی خبر دی ہو اور اس کا کوئی جائز متبادل موجود نہ ہو کیوں کہ ضرورت کے موقع پر حرمت ختم ہو جاتی ہے، لہذا وہ حرام سے علاج کرانے والا ہوا ہی نہیں۔ اسی طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ''اصحاب عرینہ'' کو از راہِ علاج اونٹ کا پیشاب پینے کی اجازت دینا بھی اس امر کی واضح دلیل ہے۔ (ترمذی: ۱/۲۱، باب ما جاء فی بول ما یوکل لحمہ)

اور مردہ جانوروں کے وہ اعضاء جن میں حیات نہیں ہوتی، مثلاً بال، ناخن، کھر، دانت، سنگ اور خشک ہڈیاں وغیرہ، تو یہ بھی طاہر اور پاک ہیں، اسی طرح ان کی کھالیں بھی دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے حیوانی بوسیدہ ہڈی سے اپنا علاج کرنا ثابت ہے، لیکن اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک انسان کے اعضاء کی دوسرے انسان کے جسم میں پیوندکاری جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں دو طرح کے موقف کھل کر سامنے آتے ہیں، ایک عدمِ جواز کے اور دوسرے جواز کے۔

جواز کے قائلین:

موقف اول یعنی جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ ایک انسان کے عضو کو کسی زندہ انسان کی جان بچانے کے لیے پیوندکاری (جوڑنا) جائز ہے، کیوں کہ اِن کے پیش نظر وہ فقہی قواعد و ضوابط ہیں، جن کے مطابق ضرورت کی بنیاد پر ناجائز چیزیں بھی جائز قرار پا جاتی ہیں، مثلاً "**الضرورات تبیح المحظورات**" (الاشباہ و النظائر: ۹۴، القاعدۃ الخامسۃ) یا اسی طرح یہ قاعدہ کہ: ''جب مشقت و پریشانی لاحق ہوتی ہے، تو یسر و سہولت کی راہیں اختیار کی جاتی ہیں'' نیز موقف اول نے ان قواعد کو قرآن کی آیت سے بھی مستنبط کیا ہے، جن میں جان بچانے کے لیے حالتِ اضطرار میں حرام چیزوں کے کھانے یا حالتِ اکراہ میں کلمۂ کفر زبان سے ادا کرنے کی اجازت دی ہے، چناں چہ ارشاد باری تعالی ہے: **فمن اضطر فی مخمصۃ غیر متجانف لاثم فان اللہ غفور رحیم** (المائدۃ: ۳) یعنی جو شخص

شدتِ بھوک میں بے تاب ہو جائے، بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہوتو، یقیناً اللہ تعالی معاف کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

اسی طرح صاحبین رحمہ اللہ کا مشہور مسئلہ ہے، جس میں ان لوگوں نے بطور علاج پیشاب کے استعمال کی اجازت دی ہے، چناں چہ وہ کہتے ہیں: **وقالا : لا باس بابوال الابل و لحم الفرس للتداوی.** (ردالمحتار: ۵/۲۱۶) یعنی صاحبین کے نزدیک ازراہ علاج گھوڑے کے گوشت اور اونٹ کے پیشاب میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قائلین میں سے ہی بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر کوئی اپنے کسی عضو کا عطیہ کرے اور پھر وہ انتقال کر جائے، تو ایسی صورت میں اس مرے ہوئے شخص کا یہ عضو اس کے لیے یقیناً صدقہ جاریہ ہوگا، اور علامہ سمرقندی رحمہ اللہ نے ایک خاص جزئیہ پر بحث کرتے ہوئے جس اصول سے استدلال کیا ہے، وہ یہی ہے کہ ایک انسان کی بقا کے لیے دوسرے کی تکریم کے پہلو کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، چناں چہ وہ فرماتے ہیں: **لو ان حاملا ماتت و فی بطنها ولد یضطرب فان کان غالب الظن انه ولد حتی و هو فی مدة یعیش غالبا یشق بطنها لان فیه احیاء الأدمی فیترک تعظیم الأدمی اهون من مباشرة سبب الموت.** (تحفة الفقهاء: ۳/۳۴۳)

یعنی اگر کوئی حاملہ مر جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ ہو، جو حرکت کرتا ہو، اگر غالب ظن ہو کہ وہ بچہ زندہ ہے اور اتنی مدت تک کا ہے، جس میں عام طور پر بچہ زندہ رہ جاتا ہے، تو اس حاملہ کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا، اس لیے کہ اس میں ایک انسان کی زندگی بچانا ہے اور کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے کہ آدمی کی تعظیم و تکریم کے تقاضے کو چھوڑ دیا جائے۔ استدلال کا مقصد یہاں یہ ہے کہ تعظیمِ میت کو ایک زندہ نعش کی بقا کے لیے ترک کیا جا رہا ہے، لہٰذا ایک زندہ انسان کو بچانا مردہ انسان کی تکریم و شرافت سے بڑھ کر ہے۔

الغرض ! **الضرورات تبیح المحظورات.** (الاشباہ و النظائر: ۹۴) ''**الضرر یزال**'' (حوالہ سابق) **المشقة تجلب التیسیر.** (الاشباہ و النظائر: ۸۴) فقہی عبارات اور قرآن کی آیت کا حاصل یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت ناجائز چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں اور انسان کی جان بچانے کی خاطر اور اس کو ہلاکت کے عالم سے بچانے کے لیے حرام اشیاء کا استعمال بھی علاج کے طور پر درست ہو جاتا ہے اور اعضاء انسانی کے عطیہ کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔

(جاری)

وفیات:

وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا

ترجمانِ اہل حق حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحبؒ

مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی

اس کارگہ عالم میں ہر دور میں قافلۂ ہستی کے کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کرداروں اور کارناموں کی بدولت ممتاز مقام اور انفرادی شان کے حامل ہوجاتے ہیں، وہ تاریخ ساز اور عہد آفرین ہوتے ہیں، ان کا وجود قوموں کے لئے سائبان اور ان کی رحلت رنج والم کی سخت دھوپ ہوتی ہے۔ علمی دنیا کی عہد ساز شخصیت، اقلیم خطابت کے تاجور، باطل کے خلاف شمشیر برہنہ، محافظ ناموس صحابہ، جید عالم دین، فکر دیوبند کے آرگن، حق وصداقت کی بے باک آواز اور ملی وسیاسی رہنما حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی انہیں ہستیوں میں سے ایک تھے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اور جو آج بتاریخ ۲۴/اپریل ۲۰۲۴ء بروز بدھ اسلام کی حفاظت وصیانت کی راہ میں زندگی بھر جدوجہد کا صلہ لینے کے لئے اس سرائے فانی سے مالک حقیقی کی بارگاہ کی طرف رخصت ہوگئے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب نابغہ روزگار شخصیات میں سے تھے، وہ اسلام کے بنیادی احکامات اس کے اصول وضوابط وحدانیت کے اسرار ورموز پر گہری نظر رکھنے والے متبحر عالم دین تھے، وہ عمدہ اور فیض رساں مدرس تھے، اسلام کے سنگی قلعے پر بدعات ورسومات کی سنگ باریوں کا منھ توڑ جواب دینے والے بے باک اور جرات مند خطیب اور مقرر تھے، انھوں نے پوری زندگی علاقائی مجلسوں سے لیکر ملکی پیمانے پر اسلام کے صحیح افکار ونظریات کی ترجمانی کی ہے، اوہام وخرافات کی تاریکیوں میں نصف صدی تک قندیل رہبانی کا کارنامہ سرانجام دیا ہے، باطل کے طوفانوں میں پوری قوت سے شجر اسلام کی پاسبانی کی ہے، وقت کے آزر کدے میں پوری شان سے توحید کی آواز بلند کی ہے، درحقیقت وہ اسلامی عقائد کے محافظ تھے، راہ حق کے رہنما تھے اپنے جدامجد امام اہل سنت کے جانشین تھے، ملت اسلامیہ ہند کی کشتی کو ساحلوں سے ہم کنار کرنے والے مخلص ناخدا تھے، اور اسلامی علوم ومعارف کی سوغات عطا کرنے والے عظیم مصنف واسکالر تھے۔

فیاض ازل نے انہیں علم کی گہرائی، نظر کی وسعت اور فکر کی بلندیوں کے ساتھ افکار کے انتقال اور معلومات کی ترسیل کا زبردست ملکہ عطا فرمایا تھا، احقاق حق اور ابطال باطل میں تو ان کی زندگی برق بے اماں کے مانند تھی کہ باطل کے خرمنوں پر وہ جب بھی گرتی انہیں خاکستر کرڈالتی، لکھنؤ کی سرزمین کئی صدیوں سے شیعوں کی آماجگاہ اور مرکز کہلاتی تھی، اور آج بھی یہ خطہ ان کے لئے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، نصف صدی قبل تک یہاں خود ساختہ روایات اور رسومات کے ہنگاموں میں اہل سنت کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا معلوم ہوتی تھی، اسی دور میں اسلام کا

ایک درویش حق کا علم لے کر کھڑا ہوا اس نے اپنے ٹھوس علم، تحریر وتقریر کی مثالی صلاحیتوں، ایمانی قوت وصلابت کے ذریعے دیوانہ وار اس معرکۂ حق وباطل میں قدم رکھا، اور اپنی اثر انگیز تقریروں، حق وصداقت کا نقش ثبت کرنے والے مناظروں اور مسلسل مجلسوں میں وعظ وبیانات کے ذریعے رسالت کی معصومیت، خلفائے راشدین کی عدالت اور صحابہ کرام کی پاکیزگی کا اثبات کیا، ان نفوس قدسیہ کی عظمت ورفعت سے ایک عالم کو آشنا کیا، دنیا نے حق کے اس مینار کو، صداقت کی اس روشنی کو امام اہل سنت علامہ عبدالشکور فاروقی کے نام سے جانا، حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی اسی تاریخی انقلابی اور عہد ساز شخصیت کے پوتے ہیں۔ ایک طرف عظیم خانوادے کی علمی، روحانی اور فکری فضا، دوسری طرف موروثی خصوصیات اور تیسری طرف عالم اسلام کے دو مرکزی اداروں مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند کی تعلیم وتربیت آپ کی زندگی کو حاصل ہوئی ان تینوں اسباب وعوامل نے آپ کو بھی اسلامی افکار کا ترجمان، درست منہج کا نقیب، اور ناموس رسالت کا محافظ بنا ڈالا۔

چنانچہ تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ بنیادی طور پر آپ نے اسی محاذ پر قدم رکھا، اور پھر پوری زندگی شیعت کی بیخ کنی اور حق کی حفاظت میں گذار دی، لکھنؤ میں ماتمی جلوسوں اور مجلسوں میں صحابہ کرام پر علی الاعلان تبرا بازی ہوتی اور کھل کر ان پر سب وشتم کا سلسلہ جاری تھا، مولانا علیہ الرحمہ نے ان پست حرکتوں پر سخت نوٹس لیا، اور نہایت جرات مندانہ انداز میں ان رکیک حملوں کا جواب دیا، انھوں نے شیعت کے اس طلسم کو توڑنے کے لئے ملکی پیمانے پر مدح صحابہ کی مجلسیں منعقد کیں، تحفظ نبوت کی تحریک چلائی، ان کی قیادت میں تحریک مجلس تحفظ صحابہ اور دارالمبلغین نے بے شمار اجلاس اور کانفرنسیں منعقد کیں، دارالمبلغین کے پلیٹ فارم سے انھوں نے بڑے پیمانے پر تاریخی اجلاس منعقد کئے، محرم کے مہینوں کے پہلے عشرے میں ایک عرصے تک اس تنظیم کے زیر اہتمام مسلسل احقاق حق کے جلسے منعقد ہوئے، جن میں مولانا فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر انگیز اور باطل کے پردے چاک کرنے والی تقریروں کے علاوہ اس موضوع پر اختصاص رکھنے والے ملک کے مشہور اور نامور علماء وخطباء نے اہتمام سے شرکت کی، ان کی مدلل تقریروں اور محققانہ خطبات سے لکھنؤ کی فضاؤں میں ارتعاش پیدا ہو گیا، یقینا یہ مولانا مرحوم کا تاریخ ساز کارنامہ ہے جس کے نتیجے میں اہل سنت کے دلوں پر مزعومہ نظریات کی چھائی ہوئی دھند چھٹ گئی، اہل تشیع کا زور کافی حد تک کم ہو گیا، بے محابا صحابہ کرام پر تبرا بازیوں کی تاریکیاں علماء حق کے تابڑ توڑ اور جرات مندانہ جوابات کے سامنے سمٹنے پر مجبور ہو گئیں، اسلام کے صحیح عقائد سے ایک عالم آشنا ہوا، ناموس رسالت کی شمعیں پوری آب وتاب سے لوگوں کے دلوں میں روشن ہو گئیں، عظمت صحابہ کے چراغ ہر سو جل اٹھے، اور توحید کے شفاف نظریات کی تبلیغ واشاعت کی راہیں ہموار ہوئیں۔

خطابت کے وہ اوصاف جو سامعین کو گرویدہ واسیر کرتے ہیں، فکر ونظر میں انقلاب لاتے ہیں، دلوں کی دنیا پر خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں وہ سب بدرجہ کمال آپ کی ذات میں موجود تھے، لفظوں کی حسن ترتیب، ادیبانہ

اور مرصع جملے لکھنؤ کی دل نشیں زبان اور محویت طاری کرنے والے اپنے مخصوص لہجے کے ذریعے وہ پورے مجمع پر حکمرانی کرتے تھے۔

۲۰۰۳ء میں مولانا اسعد مدنی کی قیادت میں دہلی کا اجلاس منعقد ہوا تھا اس وقت مولانا فاروقی جمعیت علمائے ہند کے ناظم عمومی تھے، عموماً بڑے پیمانے پر اجلاس کی نظامت مولانا فاروقی ہی کے سپرد ہوتی تھی اس مرتبہ نظامت مولانا محمود مدنی نے شروع کی مگر انسانوں کا ایک سمندر تھا جو قابو سے باہر تھا بالآخر درمیان میں مولانا فاروقی نے مائک لیا اور اپنی گرج دار اور سحر طراز آواز سے چند منٹ میں پورے مجمع کو کنٹرول کر لیا۔

حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب ۱۹۴۸ء مطابق ۱۳۶۷ھ میں اپنے آبائی وطن لکھنؤ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی، عربی کی ابتدائی چند سالوں کی تعلیم جامعہ حسینیہ محمدی لکھیم پور سے حاصل کی بعد ازاں ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء تا ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۸ء تین سال شرح جامی سے مشکوۃ تک کا نصاب جامعہ مظاہر علوم سہارنپور سے مکمل کیا، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور یہاں ۱۹۶۹ء میں دورہ حدیث مکمل کر کے سند فضیلیت حاصل کی، دیوبند میں آپ نے بخاری اول فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد مرادآبادی سے اور جلد ثانی فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی سے پڑھی، نیز یہاں آپ کے اساتذہ اساطین امت مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا عبدالاحد صاحب مولانا حسین احمد صاحب بہاری مولانا اسلام الحق صاحب کو پا گنجی، مولانا سید حسن دیوبندی اور مولانا نصیر احمد صاحب رحمہم اللہ بھی تھے جن سے آپ نے حدیث کی مختلف کتابیں پڑھیں، فراغت کے بعد جدامجد کے مشن میں پوری قوت سے سرگرم ہو گئے، اور پھر آخری وقت تک اس سے وابستہ رہے۔

جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے بھی مولانا علیہ الرحمہ نے شاندار کارنامے انجام دیئے، اور ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۲ء تک اس تحریک کے ناظم عمومی کی حیثیت سے ہر نازک وقت میں بساط بھر ملت کی ناخدائی کی، یہ عہد مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ کا تھا، جمعیۃ کی تقسیم کے بعد مولانا سید ارشد مدنی کی قیادت سے وابستہ ہوئے اور ۲۰۰۸ء سے ۲۰۲۰ء تک مستقل جنرل سیکرٹری کے منصب پر فائز رہے ۲۰۲۰ء میں ممبئی کے مسافر خانے میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس منتظمہ میں مولانا مدنی مدظلہ نے آپ کو نائب صدر بنایا راقم اس وقت وہاں موجود تھا، اس منصب کو ناچار قبول کرتے ہوئے مولانا فاروقی نے بڑے جذباتی لہجے میں حاضرین کو خطاب کیا تھا، تاہم حکم کی تعمیل میں انھوں نے صدر کی حیثیت سے بھی ملت کی رہبری اور خدمت کی۔

مولانا فاروقی کی علمی بلندی اور متنوع خدمات کے باعث ملک کے اہم اور مرکزی اداروں نے اپنا پاسبان اور سرپرست ونگراں بنایا، ملک کے مختلف مناصب اور عہدے ان سے وابستہ تھے، وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کے رکن، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے رکن، امیر شریعت اتر پردیش، اور حضرت مولانا ارشد مدنی کے معتمد خاص تھے۔ حضرت مولانا فاروقی صاحب ادھر کئی سالوں سے علیل تھے لکھنؤ کے ہاسپٹل میں عمدہ نگہداشت

کے تحت علاج جاری تھا،مگر چونکہ سفر تمام ہو چکا تھا،منزل آ چکی تھی اس لیے علاج کی تدبیریں کارگر نہ ہوسکیں معالجین کی رائے پر انھیں ہاسپٹل سے گھر لے جایا گیا،اور پھر دوروز بعد دعاؤں کے ہجوم میں آپ کی روح قفس عنصری سے ہمشہ کے لئے عالم بالا کی طرف پرواز کرگئی۔

جنازے کی نماز انسانوں کے ایک سمندر نے ندوۃ العلماء کے وسیع صحن میں ادا کی اور پھر ہزاروں سوگواروں کی موجوگی میں علم وعمل کے اس ماہ تاباں کولکھنؤ کے عیش باغ میں سپردخاک کردیا گیا۔

اب اک ہجوم عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا

(**بقیہ صفحہ:۶/ کا**)خاص طور سے امارات نے جو کردار اس حوالے سے پیش کیا ہے اوراسرائیل کی سفارتی امداد کرکے جس طرح بے ضمیری کا ثبوت دیا ہے اس سے واضح ہے کہ ان کے نزدیک خدااوررسول کی حیثیت بعد میں ہےاور یہود ونصاری کی اہمیت پہلے،ان کی پالیسیاں اوراقدامات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالی کو چھوڑ کر صہیونیت اورصلیبیت کو خدا تسلیم کرلیا ہے۔

اس المیے کے باوجود تنہا مجاہدین اب بھی دنیا کی طاقت کے سامنے سینہ سپر ہیں،ان کی عوام نے فاقے کی حالت میں بھی مدد کے لئے درندوں اورانسان نما حیوانوں کے آگے اپنے ہاتھ دراز نہیں کئے،بچوں نے دم توڑتی ہوئی ماؤں کو دیکھا،والدین نے شیر خوار معصوموں کو چشم زدن میں موت کے پنجوں میں دیکھا،مگر پہاڑوں جیسے صبر کا مظاہرہ کیا،صحابہ جیسی صلابت ایمانی کا ثبوت دیا،چٹان جیسا مضبوط ایمان اور اصحاب رسول جیسا یقین رکھنے والی اس سرفروش اور جانثار قوم کو خلاق عالم تنہا نہیں چھوڑے گا،اس قوم کی بھی سحر ہوگی،اس کے آثار بھی اب واضح طور پر نظر آرہے ہیں،ایرانی حملے کے بعد ظالموں نے سوچا تھا کہ اب مخالفتوں کی آندھیاں رک جائیں گی مگر دنیا اتنی بے وقوف تو نہیں۔

چنانچہ تل ابیب کی شاہراہیں اب بھی مظاہرین سے بھری پڑی ہیں،امریکہ کی اکثر یونیورسٹی کے تمام اساتذہ وطلبا ملکی پیمانے پر احتجاجی مظاہرے کررہے ہیں،اورحکومت کی تمام پابندیوں کے باوجود مظاہروں میں وسعت ہوتی جارہی ہے عین ممکن ہے کہ انہیں کے ذریعے ظلم وجبر کی تاریکیاں کافور ہوجائیں۔

اس مقام پر ہماراایمانی فریضہ ہے کہ ہم کم ازکم اتنا تو کریں کہ مظلوموں کے لئے دعاؤں کے ساتھ ساتھ عملی طور پر اسرائیل کی تمام مصنوعات کو اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے خارج کردیں،تاکہ دنیا میں ایک خانماں برباد اور مظلوم ملت سے اظہار یکجہتی بھی ہواور آخرت میں اس کے تعاون کا ثبوت بھی۔

وفیات:

رنج کس کا ہے کہ ساری انجمن خاموش ہے
حضرت مولانا محمد ذاکر قاسمیؒ

مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی

اپریل کی ۱۶؍تاریخ کی صبح میں جب کہ گرمی اپنے شباب پر تھی، اچانک کمرے میں حافظ محمد مسلم صاحب مؤذن مسجد انوار داخل ہوئے اور یہ خبر سنائی کہ مولانا محمد ذاکر صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، اس اطلاع پر ذہن میں کسی قسم کا کوئی ارتعاش محسوس نہیں ہوا، خیال تھا کہ کوئی ذاکر صاحب ہوں گے، انھوں نے دوبارہ بڑے وثوق سے کہا کہ مسجد کینا مارکیٹ کے جو امام ہیں انہیں کا انتقال ہوا ہے فوراً موبائل دیکھا تو ان کی وفات کی خبر تقریباً سارے گروپ میں گردش کر چکی تھی، اس خبر سے دل کو ایک شاک سا لگا، رنج والم کے ساتھ حیرت واستعجاب میں بھی دل ڈوب گیا، اس لئے کہ مولانا مرحوم کی عمر ابھی کوئی بہت زیادہ نہیں تھی، اور انہیں شوگر کا مرض ضرور تھا مگر اس کے علاوہ کسی قسم کی کوئی سنگین بیماری لاحق نہیں تھی، ظاہرا وہ بڑے تندرست، چاق وچوبند، توانا اور صحت مند تھے، ان کا صحت منداور لحیم شحیم سراپا دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ اس قدر عجلت میں ان کی زندگی کا سفر مکمل ہوجائے گا، لیکن ظاہر ہے کہ ہر چیز تقدیر کے ماتحت ہے اور اچانک وفات کا یہ سانحہ بھی اسی لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق رونما ہوا، عمر کا کارواں اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا، بالآخر داعی اجل کی آواز پر دوسرے جہان کی طرف ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔

مولانا محمد ذاکر صاحب قاسمی بڑی خصوصیات کے مالک تھے، وہ ایک اچھے عالم دین تھے، مسجد کینا مارکیٹ گوونڈی کے امام وخطیب تھے، مدرسہ تعلیم القرآن گوونڈی کے بانی ومہتمم تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ جمعیۃ علماء مہاراشٹر مولانا محمود مدنی کے جنرل سیکرٹری بھی تھے، ان کی زندگی حرکت وعمل کا بہترین نمونہ تھی، بیک وقت وہ اپنے ادارے کا نظام بھی دیکھتے تھے، امامت وخطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے، جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے صوبہ مہاراشٹر کی ملی، سیاسی اور سماجی خدمات میں بھی مسلسل سرگرم تھے، اپنے وطن بہرائچ میں اسلامی طرز پر انگلش میڈیم اسکول کی یہیں سے نگرانی بھی کرتے تھے، نیز دینی وعلمی اور سماجی پروگراموں میں مستقل نظامت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے، بلکہ خاص طور سے گوونڈی کے تمام دینی جلسے اور ملی پروگراموں کی نظامت ان کی ذات کے ساتھ خاص ہوچکی تھی، انھوں نے گوونڈی میں علاقائی سطح پر یہاں کے علماء وائمہ مساجد کو اعتماد میں لیکر تنظیم علماء اہل سنت والجماعت کی بنا رکھی اس تنظیم کے ذریعے بھی انھوں نے گوونڈی کی سطح پر بھی قابل ذکر دینی وملی اور سماجی خدمات انجام دیں، محرم کے مواقع پر کئی سالوں تک انھوں نے اہتمام سے گوونڈی کی مختلف مساجد میں بدعات ورسومات

کی بیخ کنی کے لئے پروگرام بھی کرائے، اور نوجوانوں کی اصلاح کے لئے انسداد منشیات پر مختلف مقامات پر جلسے بھی ان کی قیادت میں منعقد ہوئے۔

کمال یہ ہے کہ اتنے متعدد محاذوں پر سرگرمیوں کے باوجود ان کی پیشانی پر الجھنوں پریشانیوں اور حد سے زیادہ تفکرات کی کہیں کوئی لکیر نظر نہیں آتی تھی، وہ پورے اعتماد وسکون کی حالت میں اپنے سارے کام انجام دیتے رہتے تھے۔ مولانا محمد ذاکر قاسمی بہت خلیق، ملنسار اور خوش مزاج تھے، وہ نظریاتی لحاظ سے موافق اور مخالف ہر ایک سے بہت کھل کر اور محبت سے ملتے تھے، گفتگو میں بلا کی نرمی اور لہجے میں شیرینی تھی، وہ ساتھیوں اور اہل تعلق میں غصہ بھی ہوتے تھے مگر لہجے سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ ناراضگی اور آواز کی سختی مصنوعی ہے، وہ جب بھی ملتے خندہ پیشانی سے ملتے اور ہمیشہ سلام وکلام میں سبقت کر جاتے، ان کے ہمعصروں میں یہی صفت انہیں انفرادیت عطا کرتی ہے، اور اسی وصف نے انہیں نہ صرف طبقہ علما بلکہ اہل سیاست اور سماجی حلقوں میں بھی مقبولیت کے مقام پر کھڑا کیا ہے۔

مولانا محمد ذاکر صاحب عمل کے آدمی تھے اور اس حوالے سے وہ افراد سے کام لینا جانتے تھے، وہ مرتبہ شناس تھے، اہل علم اور اہل فن کی بہت قدر کرتے تھے، مدرسہ معراج العلوم چیتا کیمپ کے بانی قاری صادق صاحب مدظلہ مرحوم سے عمر میں بڑے ضرور تھے مگر ان کے استاذ نہیں تھے مگر مولانا مرحوم ان کا اس طرح احترام کرتے تھے گویا وہ واقعی ان کے استاذ اور مربی ہوں، انھوں نے ہمیشہ ایک نیازمند کی طرح انہیں مخدوم اور مربی ہی کے لفظ سے پکارا، اسی طرح وہ چھوٹوں کے ساتھ بھی بہت احترام کا معاملہ کرتے تھے، راقم الحروف سے ان کا رابطہ بس واجبی سا تھا مگر اپنے ہر پروگرام میں خصوصیت سے دعوت ضرور دیتے، حاضری پر اہتمام سے ملاقات کرتے، مولانا مرحوم طبعاً بہت سادہ بھی تھے اور بے تکلف بھی، جو بات انہیں حق محسوس ہوتی بے تکلف کہہ دیتے، اس میں کسی تصنع وغیرہ سے کام نہیں لیتے تھے، سادگی کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے موبائل کے اس دور میں استطاعت کے باوجود کبھی ملٹی میڈیا موبائل استعمال نہیں کیا، وہ صرف گفتگو کی غرض سے بغیر کیمرے کا چھوٹا سیٹ استعمال کرتے تھے۔

یادش بخیر چند سال قبل مرحوم نے تنظیم اہل سنت والجماعت کے زیر اہتمام سیمینار کے انعقاد کا ارادہ کیا، اس کے لئے چند علماء کی میٹنگ بلائی، ہمیں بھی خاص طور سے مدعو کیا، اثنائے گفتگو کسی نے نظم وترتیب کے بارے میں گفتگو کی تو انہوں نے منع کر دیا اور راقم سے گفتگو کے لئے کہا، اور اس وقت جو رائے ہم نے دی بہت خوشی سے قبول کیا، ان کے یہاں کبھی حاضری ہو جاتی تو اس قدر توجہ کرتے کہ محسوس ہوتا کہ مسرتوں سے سرشار ہیں۔

مولانا محمد ذاکر صاحب مرحوم کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ بہت مہمان نواز تھے، مہمانوں کی آمد پر وہ بہت خوشی کا اظہار کرتے، حتی الوسع ان کی ضیافت کرتے، اکثر وہ یونہی بغیر کسی سبب کے خطہ گوونڈی کے تمام ائمہ مساجد

اور احباب کی دعوت کرتے یہ تعداد کبھی کبھی پچاس سے سو تک بھی ہوتی، ملاقات کے بعد پوچھنے پر کہتے کہ بہت دن ہو گیا تھا اس لیے علماء کے اجتماع کے لئے دعوت کی، تاکہ ایک جگہ ہر ایک سے ملاقات ہو اور رابطہ میں استحکام ہو۔

مولانا محمد ذاکر قاسمی صاحب اپنے آبائی وطن بہرائچ میں ۱۹/ جون ۱۹۷۴ء کو پیدا ہوئے، ناظرہ وابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم بلرام پور سے حاصل کی ۱۹۸۲ء میں کانپور آئے اور ۱۹۸۶ء تک یہیں مدرسہ تجوید القرآن میں رہ کر حفظ قران مکمل کیا، ۱۹۸۶ء میں اسی شہر کانپور کے معروف ادارہ مدرسہ مظہر العلوم کے شعبہ فارسی میں داخلہ لیا اور ۱۹۹۱ء تک یہاں رہ کر شرح جامی پڑھی، اسی سال اعلی تعلیم کے لئے از ہر ہند دار العلوم دیوبند کا قصد کیا، اور تین سال تک اس ادارے سے فیضیاب ہوکر ۱۹۹۴ء میں سند فضیلیت حاصل کی، رسمی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدرسہ فیض العلوم سرائے میر اعظم گڈھ سے باضابطہ تدریس کا آغاز کیا اور ۱۹۹۷ء تک اس ادارے میں ابتدائی کتابوں سے لیکر ہدایہ تک کی کتابیں پڑھائیں، کچھ ناگزیر وجوہات نے اسی سال گوونڈی ممبئی کی ایک مسجد میں آپ کو پہونچا دیا، کینا مارکیٹ گوونڈی میں واقع اس مسجد میں امامت وخطابت کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم وتدریس کا بھی سلسلہ شروع ہوا، اور کچھ عرصہ بعد مدرسہ تعلیم القرآن کے نام سے اس مکتب نے ادارہ کی شکل اختیار کر لی (معلومات از مولانا محمد اشفاق صاحب استاذ جامعہ معراج العلوم چیتا کیمپ ممبئی)۔

زندگی کا سفر اب مکمل ہو چکا تھا اس لئے مولانا مرحوم نے ایک فعال، متحرک، سرگرم اور جدوجہد سے بھرپور زندگی گذار کر ۱۶/ اپریل ۲۰۲۴ء بروز منگل آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے، ان کی رحلت کی خبر بہت تیزی سے ہر طرف پھیل گئی رات ساڑھے دس بجے دیونار قبرستان میں جنازے کی نماز ادا ہوئی عوام کا ایک سیلاب تھا، ممبئی میں ہم نے اتنی بڑی تعداد جنازے میں پہلی بار دیکھا، مولانا مرحوم کے داماد جو عالم دین ہیں نماز پڑھائی اور پھر ہزاروں سوگواروں کی موجوگی میں ہمیشہ کے لئے انہیں سپرد خاک کر دیا گیا، مرحوم کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں صرف ایک بچی کا نکاح ہوا ہے باقی تمام بچے ابھی کم عمر ہیں اللہ تعالیٰ ان کی کفالت کا سامان مہیا فرمائے آمین۔

ادبی شاہکار: **قسط اول:**

تاروں بھرے آسمان سے یہ مٹھی بھر تارے

خواجہ کوثر حیات، اورنگ آباد (دکن)

ادب زندگی کا عکاس اور ادب میں ہونے والی تبدیلیاں، آغاز، ارتقاء، تدریجی مراحل اور مختلف ادوار میں ان کی حیثیت اور اصناف پر کیا جانے والا تجزیہ ہی تنقید و تحقیق ہے۔ تنقید و تحقیق جگر کاری و عرق ریزی سے کیا جانے والا مستند کام ہے جو اصناف کے متعلق قاری کی سوچ اور تخیلات کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ محقق اور نقاد کا کام نئی گرہیں دلائل کے ساتھ تشنگان علم و ادب کے روبرو کرنا ہوتا ہے۔

ادب کی ترقی و ترویج اور اشاعت میں تحقیق و تنقید کی بنیادی حیثیت ہے۔ اسی سے قومیں اپنی تاریخ کو محفوظ کرتی ہیں۔ تنقید و تحقیق میں نمایاں کارکردگی کرنے والوں کی طویل فہرست ہے جن میں چند ناموں کا ذکر کر رہی ہوں۔ گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، وارث علوی، لطف الرحمن، ابوالکلام قاسمی، شمیم حنفی، علی احمد فاطمی، قاضی افضال حسین، مہدی جعفر، ابوالفیض سحر، اختر الواسع، قمر رئیس، ناصر عباس نیر، وہاب اشرفی، شافع قدوائی، قدوس جاوید، ضمیر علی بدایونی، ڈاکٹر عتیق اللہ ہی ناقدین میں شیخ عقیل احمد کا کام بھی نمایاں ہے جنھوں نے اپنے تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں کے ذریعے ادب میں مزید مثبت اضافہ کیا ہے جن میں غزل کا عبوری دور، 'مغیث الدین فریدی اور قطعات تاریخ'، 'تفہیمات اور ترجیحات'، 'فن تضمین نگاری' اور ادب اسطور اور آفاق' شامل ہیں۔ آپ کی نگرانی اور سرپرستی میں اردو کے مؤقر رسالہ جات 'فکر و تحقیق'، 'اردو دنیا'، 'خواتین دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' تواتر سے خوبصورت ترتیب و تدوین سے شائع ہو کر قارئین تک پہنچ رہے ہیں۔ مستقل غور و فکر اور مسلسل مطالعہ کے باعث اربابِ علم اور اہل ذوق میں عقیل احمد کا شمار ناقدین میں کیا جاتا ہے۔ آپ کی تنقیدی بصیرت پر مبنی تصنیف عبوری دور کی غزلوں میں اساسی فکر کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ شیخ عقیل احمد کی پہلی تنقیدی و تحقیقی کاوش ''غزل کا عبوری دور'' میں غزل کا تعارف اہتمام سے کیا ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے آخر میں اردو غزل کے رنگ و آہنگ پر تفصیلی بات کی گئی ہے۔ معتبر شعرا داغ، امیر، منیر، ظہیر، مجروح، سالک، جلال اور حالی کی منتخب غزلوں کو فنی محاسن کے ساتھ قارئین کے روبرو کیا گیا ہے۔ آپ نے غزل کے امکانات پر بات کرتے ہوئے حالی کے اس خوبصورت شعر کے اس مصرعہ کی مثال دی:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اس شعر میں حالی کے افکار کی تشریح اس طرح کی ہے؛

''حالی کے یہ دونوں شعر ان کی ذہنی کشمکش کے آئینہ دار ہیں۔ حالی غزل کے رسمی اور روایتی انداز سے بیزار

تھے مگر ان کا ذوق سلیم غزل کے شاندار ماضی کے آئینے میں اس کے تابناک مستقبل کی جھلک دیکھ رہا ہے۔ وہ غزل کے مزاج کو زمانے کے تقاضے کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔''

عبوری دور کی غزلوں میں موجود تصوف کی چاشنی، ظریفانہ عنصر، اس کے سنجیدہ معیار، ان میں پنہاں فلسفہ اور حکمت کو آشکارا کیا۔ غزل کے مزاج میں تغزل کی شیرینی بھی کشید کی ہے۔

شیخ عقیل احمد نے تصنع اور مبالغہ سے پاک وصاف غزلوں کی رعنائیوں اور دلکشی کو منتخب غزلوں سے پیش کیا ہے۔ غزلوں میں موجود زبان و بیان کی بندش اور اس میں موجود فکری عناصر پر روشنی ڈالی اور جہاں شاعری میں زندگی کی رعنائیوں کی رمق پیش کی وہیں ان میں ظاہر ہوتی دنیا کی بے ثباتی کو بھی بیان کیا ہے۔ نئی ترکیبوں اور نئے الفاظ والے اشعار کو منتخب کر کے پیش کیا ہے۔ اپنی تنقیدی بصیرت و تجزیاتی نقطۂ نظر سے اشعار کے اسلوب، احساسات اور خیال آفرینی، افکار کی ندرت اور ان میں موجود روانی و نغمگی جیسے فنی محاکات کا احاطہ کیا ہے۔ غزلوں میں واقعاتی عنصر کو تلاش کیا ان میں پوشیدہ قومی جذبات کی ترجمانی کے ساتھ اس میں محسوس ہونے والے تصورات اور پیش کیے ہوئے خیالات کی تشریح بھی کی ہے۔

ادب میں تنقید و تحقیق کی اپنی مسلم حیثیت ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تخلیقی ادب کی منصفانہ تفہیم و تعبیر کے لئے تنقید ایک موثر ذریعہ ہے۔ تنقید اصناف پر مزید گہرائی اور تجربہ کی روشنی میں کیا جانے والا جائزہ ہوتا ہے جو مختلف پہلوؤں سے تخلیق کے اسرار و رموز کو قارئین سے متعارف کروانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ نہ صرف نقطۂ نظر میں تنقید سے وسعت پیدا ہوتی ہے ساتھ ہی سوچ کے مختلف زاویے بھی وا کرتی ہے۔ ادبی کاوشوں میں شیخ عقیل احمد کے نقد و نظر سے ان کی وسعتِ معلومات، طرز استدلال، علمی متانت عیاں ہوتی ہے۔

فن تضمین نگاری شیخ عقیل احمد کی وہ کاش ہے جس کی پسندیدگی نے مبصرین، ناقدین اور قارئین کے مضامین اور تبصروں کے ذریعے نہ صرف ملک عزیز بلکہ عالمی سطح پر اسے متعارف کروایا ہے۔ فن تضمین نگاری کے متعلق اور ایک اقدام یہ رہا کہ جناب انجم عثمانی صاحب نے دوردرشن کے ادبی پروگرام میں اس کتاب پر کامیاب مذاکرہ بھی منعقد کیا ہے۔

یقیناً یہ تضمین نگاری پر ایک سیر حاصل کتاب ہے۔ آپ کی تحقیق دعوت فکر دیتی ہے۔ ''فن تضمین نگاری: تجزیہ و تنقید'' کے شائع ہونے کے بعد تضمین کے موضوع پر نئی بحث کا آغاز ہوا ہے۔ ڈاکٹر شریف الدین سابق استاذ شعبہ اردو۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی کتاب کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

''عقیل احمد صاحب مقالے کی زبان کو خواہ مخواہ بھاری بھرکم، بوجھل یا رنگین نہیں بناتے۔ انھیں سادگی اور سلاست کے ساتھ بات کو پر اثر بنا کر کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ''فن تضمین نگاری: تجزیہ و تنقید'' سنجیدہ اور باذوق قارئین کے لیے معلومات اور بصیرت دونوں کا سامان رکھتی ہے۔''

ابتدا سے ہی شاعری شیخ عقیل احمد کے لئے دلچسپی کا باعث ہونے سے آپ کے مطالعہ کا مرکز رہا ہے۔ ڈاکٹر

مغیث الدین فریدی صاحب کے مجموعہ کلام ''کفر تمنا'' کے مطالعہ کے دوران ان کی لکھی تضمین نے آپ کو بے حد متاثر کیا۔ اس دلچسپی اور تضمین نگاری میں تفصیلی کام کی محسوس ہوتی کمی کو آپ نے تحقیقی کام سے تقویت بخشی۔ اسی کتاب میں شیخ عقیل احمد لکھتے ہیں کہ:

''جس طرح اردو غزل فارسی سے اور فارسی غزل عربی سے ماخوذ ہے اسی طرح تضمین کی روایت فارسی سے اردو میں آئی ہے۔ فارسی کے متعدد کلاسیکی شعرا کے کلام کی تضمینیں فارسی میں ہوئی ہیں۔ شیخ سعدی کے کلام کی تضمینیں فارسی کے ہی ایک شاعر غلام حسین امیر خانی کی ہے جو ''تضمین گلچین سعدی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ دکنی شعرا کے کلام میں بھی فارسی غزلوں اور ہندی دوہوں کی تضمینیں ملتی ہیں۔

اس میں تضمین کے فن کی تعریف اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ تضمین کی مختلف ہئیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیا ہے کہ تضمین کے لئے کسی خاص ہئیت کی قید نہیں ہے۔ منتخب اشعار کو پیش کرتے ہوئے آپ نے فارسی کے جن مصرعوں یا اشعار کی تضمین اردو کے شعرأ نے کی ہیں۔ ان منتخب اشعار کو پیش کرتے ہوئے فارسی کے شعرأ کے اجمالی تعارف کے ساتھ ان کے مخصوص انداز فکر کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں اٹھارویں صدی کے شعراء مثلاً میر، سودا، درد، نظیر، مصحفی اور انشاء وغیرہ کی تضمین نگاری کا جائزہ شامل ہے۔''

شیخ عقیل احمد نے تفصیل سے واضح کیا کہ کس طرح اس صدی میں شعرأ نے فارسی کے کلام کی اثر آفرینی اور تہہ داری سے متاثر ہو کر فارسی کے اشعار کی تضمین اور ترجمے کیے گئے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں تضمین نگاری کی معلومات فراہم کرتے ہوے آپ روشنی ڈالتے ہیں کہ:

''شمالی ہند میں میر و سودا کا عہد اردو شاعری کا اہم ترین دور مانا گیا ہے۔ اس دور میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کا معیار متعین ہوا۔ میر نے غزل اور سودا نے قصیدہ کے نوک پلک کو اس طرح سنوارا کہ اردو غزل فارسی غزل سے آنکھ ملانے کے قابل ہو گئی اور قصیدہ فارسی کا حریف بننے لگا۔ فارسی اشعار کی تضمین اور فارسی اشعار کے ترجمے کا رجحان بڑھنے لگا۔''

مزید اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میر نے فارسی کے اشعار پر تضمین کر کے تضمین نگاری کے نت نئے پہلوؤں سے اردو شاعری کو آب و رنگ بخشا۔ فارسی اشعار کی کیفیات کی باز آفرینی، غزل کی رمزیت اور تہ داری سے شعر کے مفہوم کی نئی توجیہ کر کے میر نے تضمین کے فن کو تخلیق کا بلند درجہ عطا کیا۔ انھوں نے تضمین کی روایت اور ہیئت، (خمسہ یا تخمیس) کے علاوہ اس فن کے امکانات کو بروئے کار لانے کے لیے مثلث کی ہیئت کو بھی بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر میر نے فارسی کے مطلع پر اردو کے مطلع کی تضمین کر کے اس فن کی نادرہ کاری کا بہت دلچسپ ثبوت دیا ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے شعرأ کی تضمین نگاری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ نے واضح کیا کہ اس زمانے میں تضمین تو ہوئیں لیکن تضمین کی ہئیت میں نہ کوئی تبدیلی آئی اور نہ تنوع پیدا ہوا۔ اس عہد میں تضمین کی روایت کو بڑھایا گیا۔ غالب نے ظفر کی ایک غزل پر تضمین کی۔''

انیسویں صدی میں تضمین نگاری کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچاتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ:

''مومن خان مومن نے اپنے پسندیدہ فارسی شعراء کے کلام پر تضمین کی ہے۔انھوں نے مخمس، مثلث اور مسدس کی شکلوں میں فارسی اشعار کو تضمین کر کے میر، سودا اور نظیر کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔غزلوں کی تضمین کے علاوہ انھوں نے کہیں ایک شعر اور کہیں ایک مصرع پر کئی کئی بند تضمین کے لکھ کر اپنی جدت ادا کا جوہر دکھایا ہے۔''

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کا غزلیہ کلام برصغیر ہندو پاک کے طول وعرض میں کافی مشہور رہا ہے۔اردو کے کئی شعرأ نے ظفر کی غزلوں کی زمین میں بے شمار اشعار بھی تخلیق کئے ہیں۔ان کی ایک معروف ترین غزل کا زیر نظر مصرعہ آج بھی خاصا مشہور ہے

لائق پابوس جاناں، کیا حنا تھی میں نہ تھا

راقم الحروف کے جد امجد سید امجد حسین خطیب صاحب نے بھی اس زمین میں ایک نعتیہ قصیدہ تحریر فرمایا جو ۱۶/اشعار پر مشتمل ہے۔اسی نعتیہ قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

لائق پابوس حضرت کفشِ پاتھی میں نہ تھا — ہائے کیا اس چرم کی قسمت رسا تھی میں نہ تھا
کیا سُبک کرتی ہے آمد ورفت روضے پر نسیم — شرف یابِ بوسہ گنبد صبا تھی میں نہ تھا
جسم خوشبو دار سے حضرت کے ہے فیضیاب — حلس تھا مرط مُرحل تھی ردا تھی میں نہ تھا
(حلس = ٹاٹ، مرط مرضل = کالی کملی، بردا = چادر) — کل پڑھے جاتے تھے امجد کے قصیدے بزم میں
چوطرف سے غُل غلِ صلّ علیٰ تھی میں نہ تھا

تضمین نگاری مشکل فن ضرور ہے مگر شیخ عقیل احمد کے تنقیدی زاویے اس فن کو آسان اور عام فہم بنا کر اپنے جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔تضمین کی تعریف اور اہمیت کے متعلق شیخ عقیل احمد لکھتے ہیں کہ:

''تضمین کا فن بڑا نازک اور لطیف ہے۔غزل کے شعرأ کے لیے شعر کہنا آسان کام ہے لیکن کسی دوسرے شاعر کے شعر پر تضمین کرنا مشکل ہے کیوں کہ غزل کے ہر شعر میں شاعر کی داخلی کیفیت، رنگ وآہنگ اور اس کی پوری شخصیت کے ارتعاشات موجود ہوتے ہیں۔تضمین نگار کو اپنے مصرعوں کی تخلیق کرتے وقت ان سب باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنی شخصیت کی سطح کو اس شاعر کی شخصیت کی سطح سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے جس شاعر کے شعر یا مصرعے کی تضمین مقصود ہوتی ہے۔صرف اتنا ہی نہیں وہ اصل شعر یا مصرعے کے مفہوم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کے کچھ نامکمل پہلوؤں کو تلاش کرتا ہے اور اپنے جذبات وخیالات سے ہم آہنگ کر کے ان کے مفہوم کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے۔''

شیخ عقیل احمد نے تضمین نگاری کے فن کی مختلف ادوار میں مثالوں کے ذریعے وضاحت کی ہے۔آپ لکھتے ہیں کہ:

''مومن، نظیری نیشاپوری کی غزل کی تضمین میں بھی مطلع پر قاری کے مصرعے لگائے گئے اس غزل کی تضمین ہموار اور مربوط ہے۔نظیری کے سب سے بہتر شعر پر مومن کی تضمین بھی قابل داد ہے۔''

آنکھ پھڑکی ہے کہ آتا ہے وہ زیب انجمن شوق کہتا ہے کرو آرائش بیت الحزن
جب نہیں آیا تو کیا چلتا ہے جی کو تہ سخن ساختن ممنونِ دیدار و بحسرت سوختن
ازتصرف ہائے حرماں خداداد من ست

مومن نے نظیری کے شعر کی نئی تعبیر پیش کی ہے اور اپنے شاعرانہ تخیل سے تضمین کو پر لطف بنا دیا ہے۔ نظیری کے

ازتصرف ہائے حرماں خداداد من ست

کی تشریح اور توجیہ کے لیے آنکھ پھڑکنے کے شگون سے محبوب کے آنے کی خوش فہمی سے بہتر کوئی پیرایہ بیان نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کے افکار کی ندرت، مطالعہ اور تحقیق کی گہرائی اس سے عیاں ہوتی ہے۔ کہ ان کے ہر پہلو کو مدلل انداز میں بیان کر کے اس کی نسبت سے مثالوں کو پیش کر کے اس کی مقصدیت کو بہت ہی سلیس زبان میں پیش کر کے قاری کے تحصیل علم کی تشنگی کو دور کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں؛

''قدسی کی فارسی نعت بھی شیخ سعدی کے نعتیہ اشعار (بلغ العلی بکمالہ) کی طرح بے حد مقبول اور مشہور ہوئی۔ اردو فارسی میں اس نعت کے اشعار پر بے شمار شاعروں نے تضمین لکھی ہے اور ہر شاعر نے اس نعت کے اشعار پر تضمین کر کے رسالت ماب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان اشعار کے مصنف کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کیا ہے۔''

فکر انگیزی اور خوش اسلوبی سے متن کا احاطہ، اپنی بات کو پیش کرنے کے لئے اشعار کا انتخاب اور اس پر کی جانے والی مدلل گفتگو ان کی بات کو مبسوط و مستحکم بنا دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''بہادر شاہ ظفر نے ہر مقبول عام رائج الوقت صنف سخن میں اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔ ظفر کی تضمین نگاری ان کے رنگ سخن کی آئینہ دار ہے۔''

سادہ برجستہ اور پر اثر ظفر کے کلام میں تضمین کے خمسوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ میر کی دو غزلیں اور سودا کی ایک غزل ظفر کی تضمین سے آراستہ ہوئی ہیں۔ میر کی دونوں غزلیں میر کی نمائندہ غزلیں ہیں اور چھوٹی بحر میں ہیں۔ ظفر نے زبان کی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ تضمین کا حق ادا کیا ہے۔

جرم ثابت ہوا ہے کیا ہم پر نہیں کھلتا یہ ماجرا ہم پر
روز اک ظلم ہے نیا ہم پر اے بتو اس قدر خفا ہم پر
عاقبت بندِ خدا ہیں ہم پر

اس شعر کی تضمین میں ظفر کے تیسرے مصرعے نے میرؔ کے شعر کی تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ بڑی مربوط اور برجستہ تضمین ہوئی ہے۔ اس غزل کے مقطع کی تضمین اس اعتبار سے بہت دلچسپ ہے کہ ظفر اور میر دونوں کے تخلص تضمین کی یک رنگی اور ربط میں برابر کے شریک ہیں۔ ظفر کا تیسرا مصرع تضمین کی جان ہے ۔

جیسا تھا شاعری میں اچھا میر پتا گر قدرداں بھی ایسا میر
اس طرح اے ظفر نہ کہتا میر کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گویا اک جنس ناروا ہیں ہم (جاری)

تعارف کتب:

خانوادہ شبلی

تبصرہ: عبدالعلیم الاعظمی

نام کتاب: خانوادہ شبلی، مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،
صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۳۰۰، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس نئی دہلی

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور ان کی گراں قدر خدمات اور لازوال کارنامے اہل علم میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، شبلی کی شخصیت اور ان کی فکر کے ہر گوشے پر اہل علم گزشتہ ایک صدی سے لکھ رہے ہیں، اور ان کے افکار اور ان کے کارناموں پر لکھنے کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، موجودہ عہد میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کی فکر ونظر کے سلسلے میں بہت سے ایسے گوشوں کو دریافت کیا ہے، جن پر یا تو اہل علم کی نظر ہی نہ پڑی، یا اس سے قبل ان پر تفصیلات منظر عام پر نہیں آئی تھی، علامہ شبلی کے تعلق سے ان کی اہم گراں قدر تحقیقی تصانیف کی وجہ سے اہل علم نے انہیں ''ماہر شبلیات'' قرار دیا۔ لاریب ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی کاوشات نے اہل علم کو شبلیات کے تعلق سے نئی جہت سے روشناس کرایا اور اہل علم کو سوچنے اور غور وفکر کے نئے نئے میدان سے واقف کرایا۔ ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی تازہ تصنیف ''خانوادہ شبلی'' شبلیات میں ایک اہم اور گراں قدر اضافہ ہے۔

علامہ شبلی کے خانوادہ میں متعدد اہل علم وفن نے جنم لیا ہے، جنہوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، لیکن علامہ شبلی کی عظیم شخصیت اور ان کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے خانوادہ شبلی کی دیگر عبقری شخصیات اور ان کے کارناموں سے اہل علم کما حقہ واقف نہیں ہو سکے۔ ڈاکٹر الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

> ''اعظم گڑھ کے ان علمی وادبی خانوادوں میں فتوحات علمی کے لحاظ سے شاید سب سے کم اہم خانوادہ علامہ شبلی ہی کا ہوگا، مگر ان کے علم وفضل اور ان کے نہایت عظیم الشان اور منفرد علمی وتعلیمی اور تصنیفی کارناموں کی بدولت آسمان علم وادب پر وہ نمایاں ہوا۔۔۔۔ علامہ شبلی کے عظیم الشان کارناموں کی چھاؤں میں ان کے خانوادے کی تعلیمی وسماجی خدمات پس وپشت ہوگئیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں متعدد ایسے افراد پیدا ہوئے جو ملت کے لیے کچھ کرنے اور کر گزرنے کا بلند جذبہ اور عزم وحوصلہ رکھتے تھے، خود علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل بڑے فعال اور زبردست آدمی تھے اور بڑی اہم سماجی خدمات انجام دیں۔ ان کے دوسرے بیٹے مہدی حسن بیرسٹر اردو کے ایک ادیب اور منفرد مکتوب نگار تھے''۔

خانوادہ شبلی دیگر کارہائے نمایاں کے علاوہ دو عظیم الشان کارنامے ایسے ہیں، جس کی وجہ سے خانوادہ شبلی کو تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور ملت اسلامیہ ہند یہ اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے، ان دونوں کارناموں پر

روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے ہیں:

''خانوادہ شبلی'' نے متنوع علمی وتعلیمی اور سماجی خدمات انجام دیں۔ ایک محدود پیمانہ ہی سہی مگر بحیثیت مجموعی بڑا فائدہ پہنچا اور اس کا آوازہ وشہرہ دنیا بھر میں گونجا، اس خانوادہ شبلی کے متنوع کارناموں میں دو ایسے عظیم الشان تاریخی کارنامے شامل ہیں، جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ اول یہ کہ جدید تعلیم کے لیے علامہ شبلی نے جون ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول اعظم گڑھ کی بنیاد رکھی جو آج شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کی صورت میں ملک و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے اور گزشتہ ڈیڑھ سو برس کی تاریخ میں قوم وملت پر اس کے نہایت اہم اور مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس خطہ اعظم گڑھ میں بہ نسبت دیگر اضلاع کے جدید تعلیم کی جو رونق اور بہار دکھ رہی ہے، وہ دراصل اسی شبلی کالج کا فیضان ہے۔ شبلی اور خانوادہ شبلی کا انتہائی منفرد اور لاثانی کارنامہ دارالمصنفین کا قیام اور اس کا نظم وانصرام ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی اس عہد میں ہندوستان کیا تمام اسلامی ممالک میں بھی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ دراصل اس طرح کے علمی وتحقیقی ادارے حکومتیں قائم کیا کرتی ہیں۔ دارالخلافت بغداد میں عہد عباسیہ میں اسی نوع کا ایک ادارہ بیت الحکمت قائم ہوا تھا۔ غالبا اسی بناء پر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کو ہندوستان کے بیت الحکمت سے تعبیر کیا گیا، اعظم گڑھ کے علمی خانوادوں میں شبلی نیشنل پی جی کالج کے ساتھ اس ادارہ یعنی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے قیام کی وجہ سے خانوادہ شبلی کو تفوق کا اعزاز حاصل ہوا''۔

زیر نظر کتاب ۲۰۰ رصفحات پر مشتمل ہے، جس میں خانوادہ شبلی کے ۹ رافراد کے مستقل اور متعدد افراد کا تذکرہ ضمنی طور پر کیا گیا ہے۔ پہلا تذکرہ علامہ شبلی کے مورث اعلی چودھری سراج الدین کا ہے، ان کا اصل نام شیوراج سنگھ تھا، ایک اتفاقی واقعہ کے سبب ٹھاکر شیوراج سنگھ نے موضع خانقاہ کے ایک بزرگ شاہ رکن الدین شہباز کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ دوسرا تذکرہ علامہ شبلی کے دادا شیخ حسن علی کا ہے، یہ عدالت کلکٹری اعظم گڑھ میں مختاری کرتے تھے، جن کے چار بیٹے شیخ حبیب اللہ، شیخ مجیب اللہ، شیخ عجیب اللہ اور شیخ نجیب اللہ تھے اور ایک بیٹی مریم بی بی تھی، موخر الذکر چاروں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، شیخ عجیب اللہ کے نام علامہ شبلی کے ایک فارسی سمیت چار خطوط نقل کئے گئے ہیں۔

شیخ عجیب اللہ کی اولاد میں چیف جسٹس الہ آباد سر اقبال مشہور ومعروف شخصیت تھی۔ تیسرا تذکرہ علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ کے حالات وکارنامے پر مشتمل ہے، آپ کا شمار اعظم گڑھ کے نامور وکلاء میں ہوتا تھا، آپ سماجی ورفاہی کاموں میں پڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، ۱۸۷۴ء میں شہر اعظم گڑھ میں ایک مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھی تھی، یہ مدرسہ علامہ شبلی کی زندگی ہی میں ختم ہو گیا تھا، اس کا سبب بقول فاضل مصنف ''اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدرسہ چشمہ رحمت کے ہوتے ہوئے اس مدرسہ نے کتنی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ افسوس سر سید احمد خاں کی جدید تعلیم کی آندھی نے اس کا وجود مٹا دیا۔

شیخ حبیب کے سر سید احمد خاں مرحوم سے بہت ہی قریبی تعلقات تھے، علی گڑھ تحریک میں شروع ہی سے

شریک تھے، سرسید کے ذریعہ چلائی گئی مختلف تحریکات کا نہ صرف حصہ رہے؛ بلکہ اس کے لیے بھرپور تعاون بھی کیا۔ شیخ حبیب اللہ کو شعروشاعری سے بھی شغف تھا، ان کے مکان پر شعروشاعری کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور متعدد شعراء وادباء سے ان کے دیرینہ مراسم اور روابط تھے۔ شیخ حبیب اللہ نے پہلی شادی مقیمہ بی بی (تذکرہ آگے آرہا ہے) سے کی تھی، جن سے ایک بیٹی اور چار بیٹے محمد شبلی محمد مہدی، محمد اسحاق اور محمد جنید پیدا ہوئے۔ پہلی بیوی کی موجودگی ہی میں شیخ حبیب اللہ نے غیر کفو میں دوسری شادی کرلی تھی۔ علامہ شبلی اپنی والدہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے، نکاح ثانی اور بے التفاتی کی وجہ سے مقیمہ بی بی سخت کبیدہ خاطر اور دل گیر رہا کرتی تھیں اور بالآخر اسی غم میں ۱۸۸۶ء میں وفات پاگئیں۔ اس واقعہ نے علامہ شبلی پر گہرا اثر ڈالا، دوسرے ان کے والد نے اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ بچوں کا خیال کئے بغیر اپنی دوسری بیوی کے نام کردیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے بچوں میں ناگواری کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۔ علامہ شبلی کی اپنی والدہ سے محبت وشیفتگی کو بعض لوگوں نے کچھ اور ہی رنگ دے کر شبلی کی کردار کشی کی کوشش کی ہے، جس کی تردید فاضل مصنف نے کی ہے، اور خاندانی معاملات کو بہت واضح طریقہ سے پیش کیا ہے۔ والد کے تذکرہ کے آخر میں علامہ شبلی کا ایک فارسی مرثیہ اور والد کے نام پانچ خطوط نقل کئے گئے ہیں۔

چوتھا تذکرہ علامہ شبلی کی والدہ مقیمہ بی بی کا ہے، آپ کا تعلق موضع پھریہا سے تھا، نامور مفسر علامہ حمید الدین فراہی کی سگی پھوپھی تھیں۔ نہایت دین دار خاتون تھیں، بقول سید صاحب ''تہجد تک ناغہ نہیں کرتی تھیں۔ مولانا اکثر اپنی والدہ مرحومہ کی نیکیوں کا ذکر فرمایا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ ان کی سحر خیزی کی عادت انہیں کے حسن تربیت سے پڑی۔ پانچواں تذکرہ علامہ شبلی نعمانی کا ہے، جس میں فاضل مصنف نے اختصار وجامعیت کے ساتھ شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، بقول مصنف ''خود علامہ شبلی کے تذکرہ میں بہت اختصار سے کام لینا پڑا ہے، ورنہ ضخامت دوچند ہوجاتی۔ البتہ انہوں نے اعظم گڑھ کے تعلق سے جو خدمات انجام دیں، ان کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے۔ علامہ کی پہلی شادی مجیدن بیگم سے ہوئی تھی، جن سے دو بیٹیاں رابعہ اور فاطمہ خانم اور ایک بیٹے محمد حامد حسن پیدا ہوئیں۔ فاطمہ خانم کے مختصر حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور علامہ شبلی کے نام ان کے تین خطوط کو نقل کیا گیا ہے۔ فاطمہ خانم کا انتقال علامہ کی زندگی ہی میں ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ پہلی بیوی کے انتقال کے پانچ سال بعد علامہ شبلی نے دوسری شادی کی، جس سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، لیکن تینوں بچپن ہی میں فوت ہوگئے۔

چھٹا تذکرہ برادر شبلی مہدی حسن بیرسٹر کا ہے، مہدی حسن حافظ قرآن تھے، عربی اور فارسی کی تعلیم مولانا فاروق چریاکوٹی سے حاصل کی، ۱۸۷۸ء میں وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی، اس کے بعد علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ایف اے کی سند حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ مہدی حسن سرسید مرحوم سے بے حد متاثر تھے، سیاسی میدان میں علامہ شبلی کے بعض نظریات سے انہیں اختلاف تھا یہی وجہ ہے کہ وہ کانگریس کے مخالف تھے، لندن سے واپسی کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے، اس کے بعد ہائی

کورٹ میں ہی منصفی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مہدی حسن کی شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی، ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، ایک بیٹی پیدا ہوئی، جس کا نام شافیہ تھا۔ مہدی حسن کا انتقال ۱۸۹۷ء میں ہوا۔

بعض نظریاتی اختلاف کی وجہ سے چند اہل علم نے مہدی حسن اور علامہ شبلی کے درمیان اختلاف کا ایسا رنگ دیا ہے کہ گویا شبلی اپنے چھوٹی بھائی سے نفرت کرتے تھے، فاضل مصنف نے حقائق کی روشنی میں ان الزامات کا قلع قمع کیا ہے اور جانبین کے خطوط نقل کر کے دونوں بھائیوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کو واضح کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فاضل مصنف نے ان اسباب کی بھی نشاندھی کی ہے جس کی وجہ سے ایک طبقہ نے اس طرح کے الزامات لگانے کی کوشش کی۔ مہدی حسن کو اردو ادب سے خاص دلچسپی تھی، مکتوب نگاری میں ملکہ حاصل تھا۔ فاضل مصنف نے مہدی حسن کی مکتوب نگاری، ادبی رعنائی وگل گاری اور بزلہ سنجی اور حاضر جوابی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے مہدی حسن کے دستیاب شدہ تمام خطوط ''برادر شبلی مہدی حسن اور ان کے مکاتیب لندن'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ ساتواں تذکرہ برادر شبلی محمد اسحاق وکیل کا ہے۔

آپ ماہر قانون داں اور الہ آباد ہائی کورٹ کے نامور وکیل تھے۔ بی۔ اے اور ایل ایل بی کی تعلیم علی گڑھ کالج سے حاصل کی، آپ علامہ شبلی کے دست و بازو تھے، تمام گھریلو اور زمین دارانہ ذمہ داریاں آپ ہی کے سپرد تھی، شبلی کے قائم کردہ نیشنل اسکول کی ذمہ داریاں بھی آپ ہی سپرد کی گئی تھی۔ آپ کا انتقال شبلی کی زندگی ہی میں ۱۹۱۴ء میں ہوا، علامہ کو آپ کی اچانک موت سے سخت صدمہ پہنچا۔ آپ کی وفات پر ''بربادی خانمان شبلی'' کے عنوان سے ایک طویل مرثیہ لکھا۔ محمد اسحق نے چار شادیاں کی تھی، جس میں سے پہلی بیوی سے دو بیٹیاں حمیدہ اور محمودہ اور دو بیٹے محمود اور فاروق نعمانی پیدا ہوئے۔ فاروق نعمانی تحریک آزادی میں شریک تھے۔ اور کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ آخر میں مہدی حسن کے نام علامہ شبلی کے ۱۴/خطوط نقل کئے گئے ہیں۔ آٹھواں تذکرہ برادر شبلی حاجی محمد جنید کا ہے، آپ کانپور میں سب جج تھے، ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا۔ آپ کے ایک بیٹے انور جنید تھے، جو کہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ آخری تذکرہ علامہ شبلی کے فرزند محمد حامد حسن نعمانی کا ہے۔ ابتدائی تعلیم نیشنل اسکول سے حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ میں داخلہ لیا، علی گڑھ میں تعلیم سے زیادہ کھیل کود میں دلچسپی تھی، ۱۹۰۲ء میں ایف اے پاس کیا، ۱۹۰۵ء میں تحصیل داری کا امتحان پاس کر کے دیوگاؤں میں نائب تحصیل دار مقرر ہوئے۔ حامد حسن پولو کھیلنے کے بڑے شوقین تھے، تحصیل داری کے زمانے میں اس کھیل میں متعدد انعامات اور مڈل حاصل کئے۔ حامد حسن کی دو شادیاں ہوئی تھی، جن سے ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں، لڑکے کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ حامد حسن کے تذکرہ کے ضمن میں علامہ شبلی کے ۱۵/اور حالی کا ایک خط نقل کیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب اپنے موضوع پر ایک عمدہ کتاب ہے، اس کتاب کے ذریعہ فاضل مصنف نے خانوادہ شبلی کی مختلف شخصیات اور ان کے کارناموں سے نہ صرف روشناس کرایا؛ بلکہ ان کو زندہ جاوید کر دیا۔ فاضل مصنف نے

متعدد کتابوں، رسائل و جرائد، خطوط اور شخصی معلومات سے خانوادہ شبلی کے افراد کے حیات و کارنامے کو مرتب کیا ہے۔اس کے باوجود خانوادہ شبلی کی چند شخصیات کے مکمل احوال وکوائف کا علم نہیں ہوسکا، جس کا تذکرہ فاضل مصنف نے کیا ہے، جو کہ درج ذیل ہیں:

۱:- علامہ شبلی کی ایک حقیقی بہن تھیں، ان کا نام تک تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔(۴۳)

۲:- علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ نے دوسری شادی غیر کفو میں کی تھی، شبلی کی سوتیلی والدہ کا نام بھی نہیں معلوم ہوسکا۔(۴۴)

۳:- علامہ شبلی کے سوتیلے فرزند محمد کے سلسلے میں بھی مکمل معلومات نہیں ملتی ہیں، بقول مصنف ''تعجب ہے کہ ''تاریخ بندول'' میں خانوادہ شبلی کا جو شجرہ درج ہے، اس میں علامہ شبلی کے سوتیلے بھائی محمد کا ذکر ہے اور نہ ان کے صاحبزادے مظفر کا، یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ مظفر کے آل و اولاد بھی تھی یا نہیں اور انہوں نے کب وفات پائی''۔(۴۴)

۴:- علامہ شبلی کی بڑی بیٹی رابعہ کے مکمل حالات دریافت نہیں ہوسکے، بقول مصنف ''بڑی صاحب زادی رابعہ کے حالات اور کوائف معلوم نہیں ہوئے۔ان کی شادی اپنے گاؤں بندول میں ہوئی تھی، صاحب اولاد تھیں، ایک صاحب نے بتایا تھا کہ ان کے بچے اور پوتے وغیرہ بدرقہ شہر اعظم گڑھ میں آباد تھے''۔(۹۲)

الغرض مذکورہ کتاب اپنے موضوع پر ایک عمدہ اور تحقیقی کتاب ہے، فاضل مصنف نے اس کتاب کے ذریعہ خانوادہ شبلی کے متعدد افراد کو ہمیشہ کے لیے زندہ کردیا ہے۔لاریب شبلیات کے باب میں یہ گراں قدر اضافہ ہے۔ کتاب کا ورق عمدہ اور سرورق دیدہ زیب ہے، کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دھلی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

تعارف کتب:

امام عصر علامہ کشمیری اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

تبصرہ: مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی

نام کتاب: امام عصر علامہ کشمیری اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل،
مرتب: مفتی عبدالقیوم راجکوٹی، صفحات: ۶۷۶، ناشر: دفتر اہتمام جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، قیمت: درج نہیں۔

اسلامی علوم وفنون کی دنیا میں اور خاص طور سے علم حدیث کی سلطنت میں علامہ انور شاہ کشمیری کی ذات تاجور کی حیثیت رکھتی ہے، بے مثال علمی تبحر وبالغ نظری، فکر ونظر کی وسعت، حیرت انگیز قوت حافظہ، علوم کی جامعیت، فقہ ومسائل میں مجتہدانہ شان اور حدیث ومتعلقات حدیث پر بے پناہ عبور کی وجہ سے آپ کے ہمعصروں نے برملا یہ اعتراف کیا ہے کہ وقت اور زمانہ درمیان میں حائل ہے ورنہ شاہ صاحب کی شخصیت درحقیقت متقدمین کے قافلے کا ایک فرد تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کیا عجم اور کیا عرب ہر ایک نے آپ کی علمی عظمت ورفعت کا کھلے ذہن سے اعتراف کیا ہے، علامہ ایک عظیم محدث کی حیثیت سے دنیا میں جانے گئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مجتہدانہ صلاحیت کے حامل فقیہ بھی تھے اور عربی زبان کے ادیب بھی، مفسر بھی تھے اور متکلم اور فلسفی بھی، وہ قدرت کی ایک نشانی تھے، انکا وجود مسعود اہلحق کے لئے آفتاب جہانتاب تھا۔

ایسی نادرۂ روزگار شخصیت کا حق تھا کہ اس کی تفصیلی سوانح حیات لکھی جائے، چنانچہ ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں کی تعداد میں مختلف جہات کو اجاگر کرنے والی مستقل سوانح عمریاں لکھی گئیں پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے، اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، یہاں سوال یہ ہے کہ جب اردو عربی اور فارسی تینوں زندہ زبانوں میں تفصیلی سوانح حیات موجود ہے تو پھر زیر نظر کتاب کی ترتیب کی ضرورت کیوں پڑی، اس کا جواب یہ ہے کہ شاہ صاحب کی صورت میں علم وتحقیق کا ابر صرف دارالعلوم دیوبند ہی کی سرزمین پر نہیں برسا ہے بلکہ پانچ سال تک ڈابھیل سورت کا خطہ بھی اس بادل سے سیراب ہوا ہے، یہ کتاب اصلا انہیں پانچ سالوں کی روداد بیان کرتی ہے جو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں گذرے تھے، اس لحاظ سے یہ کتاب ایک نئے پہلو اور اہم معلومات سے اہل شوق کو روشناس کراتی ہے، شاہ صاحب اور ڈابھیل کے درمیان جو تعلق اور رشتہ تھا اس کے حوالے سے اب تک کوئی کوشش نہ ہوسکی تھی، یہ اہم کام مفتی عبدالقیوم راجکوٹی صاحب کے لئے مقدر تھا۔

مفتی عبدالقیوم راجکوٹی صاحب اُستاذ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اصلا فقہ وفتاویٰ کے میدان کے آدمی ہیں مگر قرطاس وقلم سے بھی ان کا مضبوط رشتہ ہے، خصوصا سوانح وتذکرہ کے موضوعات سے انہیں بے حد دلچسپی ہے، اس

سے قبل عالم اسلام کے مشہور محدث شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی لائف ہسٹری لکھ کر اردو زبان کے اس خلا کو پر کیا ہے۔ برصغیر کے مایہ ناز محدث شاہ صاحب کی سوانح حیات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں حضرت علامہ کے اوصاف وکمالات اور وسیع خدمات وروشن کارناموں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ کوشش اس لیے کامیاب ہے کہ مصنف نے اس راہ میں خون وپسینہ جلا کر تحقیقی جواہرات کو اکٹھا ہے اور پھر انہیں سلیقے سے ترتیب دے کر شاہ صاحب کی زندگی کا ایک مرقع تیار کر دیا ہے۔

علامہ کی ذہانت، فطانت، علمی رفعت، اور قوت حافظہ کی شہرت تو برصغیر سے عالم عرب تک پھیلی ہوئی ہے، اس حوالے سے آپ کا وجود تو اب تک انفرادیت کے اس مقام پر ہے جہاں دوسروں کا گذر نہیں، کمالات کے اس گوشے کو یہ کتاب مستند واقعات اور ہمعصروں کے بیانات کی روشنی میں اجاگر کرتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ مصنف نے اس شخصیت کی تمام جہتوں کو روشنی میں لانے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے، چنانچہ اس کتاب میں حضرت شاہ کی سوانحی تفصیلات بھی ہیں، اور تعلیمی مراحل کی روداد بھی، ان کی خداداد صلاحیتوں کا عکس بھی ہے اور خاندان اور ماحول کی تصویریں بھی، تدریسی سرگرمیاں بھی ہیں اور وعظ وخطابت کے نقوش بھی، فن حدیث میں ان کی مہارت وخدمات اور اس موضوع پر قیمتی تحریروں کا بیانیہ بھی ہے، اور مختلف موضوعات پر ان کی تحقیقاتی فتوحات کی جھلکیاں بھی۔

حضرت شاہ صاحب نے تعلیم سے فراغت کے بعد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے آستانے پر جا کر ان سے حدیث اور علوم باطنی کا فیض حاصل کیا، اس کے چند سال بعد حج کے لئے تشریف لے گئے عرب علماء سے ملاقاتیں رہیں وقت کے محدث شیخ حسین طرابلسی سے اجازت حدیث حاصل کی، واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت جانشین شیخ الہند تدریسی زندگی کا آغاز کیا، ۱۳ رسال بعد انتظامیہ سے اختلاف ہوا، ملک کے مختلف مراکز نے آپ کو اپنے یہاں لے جانے کی کوششیں کیں مگر قرعہ فال سورت کے قریب ڈابھیل کے ایک چھوٹے سے مدرسہ کے نام نکلا، اس مدرسہ کے ذمہ دار حضرت مولانا احمد بزرگ رح نے کچھ اس درد سے درخواست پیش کی کہ وہ علامہ اقبال، مدرسہ امینیہ دہلی سے ڈھاکہ تک کی دعوتوں کے مقابلے میں باریاب ہوگئی، اور پھر شاہ صاحب کے ساتھ نوافراد جو وقت کے علمی نجوم وکواکب تھے ڈابھیل فروکش ہوگئے، اور پانچ سال تک آپ کا یہاں قیام رہا پھر علالت اور وفات کے باعث فیضان انور کا سلسلہ ختم ہوگیا، ان ایام میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے کیسی ترقی کی، شاہ صاحب نے کیسی معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کیں، ان کے وجود سے علاقے پر کیا اثرات مرتب ہوئے، مدرسہ کی علمی روحانی، معاشی اور مادی اعتبار سے کتنی ترقی ہوئی، یہ پوری داستان اس کتاب میں سمٹ آئی ہے، اس کے علاوہ شاہ صاحب کے جتنے رفقاء تھے مثلاً علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور آپ کے جانشین خصوصا علامہ یوسف بنوری وغیرہ ان کے سوانحی احوال وکوائف اور اوصاف وکمالات بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

قادیانیت کو غیر مسلم ثابت کرنے میں اور ان کی دسیسہ کاریوں سے ناموس رسالت کو محفوظ رکھنے کے لئے حضرت شاہ صاحب نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں، بھاولپور میں ان کے تاریخی مقدمات میں کیا کردار رہا ہے ان کی مدلل اور محققانہ خطابت سے حج اور حاضرین کے علاوہ عوام پر کیا اثرات مرتب ہوئے، نیز حدیث کی امہات الکتب کی شروحات کا تعارف ان کی اہمیت وحیثیت کے بارے میں بھی یہ کتاب پوری تفصیلات بیان کرتی ہے، غرض یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس میں شاہ صاحب کی زندگی پورے جمال کے ساتھ نظر آتی ہے، کتاب واقعی اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے، زبان بالکل سادہ اور سلیس ہے، کتاب کا آغاز حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک، ملک کی نہایت معزز اور معتبر شخصیت مفتی احمد صاحب خانپوری، شیخ الحدیث جامعہ ہذا، اور حضرت مفتی عباس صاحب بسم اللہ صدر مفتی جامعہ ہذا فیوضہم کی تحسینی اور تہنیتی تقریظات سے ہوتا ہے، پھر عرض مرتب کی تفصیلی تحریر کے بعد، دیوبند سے ڈابھیل تک،، کے عنوان سے بہلا باب شروع ہوتا ہے پوری کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے، جن میں شاہ صاحب کی زندگی اور اس سے منسلک ایک کائنات کو آباد کیا گیا ہے۔

کتاب حسب سابق شاندار انداز میں طبع ہوئی ہے، کاغذ نفیس اور کتابت پاکیزہ ہے، سرورق بھی دیدہ زیب ہے، کتاب ذیل کے نمبر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔9824470079

آپ کے خطوط

محترم مفتی شرف الدین صاحب۔ ماہ۔ مارچ واپریل ۲۰۲۴ء کا شمارہ ''الماس'' مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

حسب دستور اداریہ (آئینۂ ایام) جس میں رمضان کی آمد کو نیکیوں کی فصل۔ بہاراں کہنا حق بجانب ہے۔ عدلیہ کا مشکوک رویہ باعث۔ تشویس ضرور ہے جس سے ایک خاص قوم کے جذبات کا مجروح ہونا فطری امر ہے۔ اس پر بے باک تبصرہ واقعی ہمت کا کام ہے۔ ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی کا مضمون- رمضان وقت کی تنظیم کا قیمتی پیمانہ، جس میں اس مہینے کو قیمتی ورکشاپ قرار دینا مبنی بر حقیقت ہے کہ اس میں شخصیت سازی ہوتی ہے۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا علامہ شبلی نعمانی کے مطالعے کا شوق، سید احمد خاں کا شبلی کی شخصیت پر اثر، ان کی تصانیف پر عمدہ اور مکمل معلومات دستیاب ہوئی۔ رئیس صدیقی صاحب کا افسانہ ''سوچ کا کرب'' اچھا لگا۔ دونوں غزلیں بھی عمدہ رہیں۔

آپ سمیت آپ کے تمام رفقائے کار کو بہت بہت مبارکباد۔

خیر اندیش:- احمد نبی۔ نداف

آپ کے مسائل

مفتی محمد آزاد بیگ قاسمی بہرائچی

سوال: ۱: میں اپنی والدہ کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتا ہوں اسی کے لیے عورت ہی ہونا ضروری ہے یا کسی نیک غریب شخص کو حج بدل پر لے جاسکتا ہوں؟ اور حج بدل کس سے کرانا افضل ہے؟

الجواب: ۱: عورت کی طرف سے حج بدل کے لیے عورت ہی ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ مرد ہونا افضل اور بہتر اور حج بدل ایسے شخص سے کرانا افضل و بہتر ہے جس نے اپنا پہلا حج کرلیا ہو اور حج کے ارکان سے واقف کار، دیندار ہو۔ لہٰذا آپ اپنی والدہ کی طرف سے غریب، دیندار اور واقف کار شخص کو حج بدل کے لیے لے جا سکتے ہیں **والافضل احجاج الحر العالم بالمناسك الذی حج عن نفسه** (البحر الرائق: ۳/۶۹، مستفاد فتاوی رحیمیہ جدید: ۴/ ۲۶۲، انوار مناسک: ۵۵۲)

سوال: ۲: حج کے تمام ارکان سے فارغ ہونے کے بعد جب صرف حلق رہ جائے تو کیا محرم حاجی صاحبان ایک دوسرے کا سر مونڈ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: ۲: تمام مناسک سے حاجی جب فارغ ہوجائے اور اب صرف احرام کھولنے کے لیے حلق یا قصر باقی رہ جائے تو حاجی صاحبان اپنا سر منڈوانے سے قبل دوسرے کا سر مونڈ سکتے ہیں بلا کراہت درست ہے۔ **و لو حلق راسه ة راس غيره من حلال او محرم جاز له الحلق لم يلزمها شئی** (غنية المناسك جديد: ۱۷۴، مستفاد انوار مناسک: ۵۲۷)

سوال: ۳: کیا رمی اور سعی کے لیے طہارت شرط ہے؟

الجواب: ۳: رمی اور سعی کے لیے یہ سعی چاہے عمرہ کی ہو یا حج کی ہو طہارت شرط نہیں ہے لیکن وضو کے ساتھ افضل و بہتر ہے۔ **و لا يشترط أن يكون الرمی علی حالة مخصوصة من قيام و استقبال و طهارة** (غنية المناسك: ۱۸۷) **و لا يجب فيه طهارة عن الجنابة و الحيض سواء كان سعی عمرة او حج لانه عبادة تودی لا في المسجد الحرام** (غنية المناسك: ۱۳۴، تاتار خانيه: ۳/ ۶۱۰، مستفاد کتاب المسائل: ۳/ ۳۵۰)

سوال: ۴: ایک شخص میدان عرفات اور مسجد عائشہ گھومنے گیے اور واپسی پر انہوں نے عمرہ کا احرام نہیں باندھا تو کیا دم دینا ہوگا؟

الجواب: ۴: میدان عرفات ہو یا مقام تنعیم (مسجد عائشہ) یہ حرم سے باہر حل میں واقع ہیں میقات سے باہر نہیں لہٰذا اگر کوئی مکہ مکرمہ میں مقیم شخص عمرہ کرنا چاہے تو ان مقامات سے عمرہ کا احرام باندھ سکتا ہے ان مقامات سے احرام باندھنا لازم نہیں ہے۔ اگر عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ نہیں کیا تو کوئی دم لازم نہیں ہوگا۔ **المكی اذا خرج الي الحل لحاجة له ان يدخل المكة بلا احرام** (غنية المناسك: ۶۵، كذا في الهندية: ۱/ ۲۲۱، درمختار: ۳/ ۴۷۴) **و المراد بالمكی مما كان داخل الحرم سواء كان بمكة لو لا سلء كان من اهلها لو لا** (شامي: ۳/ ۴۸۲، زكريا، مستفاد كتاب المسائل: ۳/ ۱۱۲)

لو جہاد

مرزاانور بیگ

یہ بیروزگاروں کی بڑھتی جمعیت
ہے مزدور طبقے کو دن بھر اذیت
ملے نہ کسانوں کو فصلوں کی قیمت
لٹے رات دن عورتوں کی بھی عصمت
نہیں حکمرانوں کو ہے اس سے الفت
بڑھے چاہے رشوت گرے یا معیشت
ہے مہنگائی کا ہر طرف بول بالا
مصاحب مگر بھر رہے گھر میں دولت
ہوئے بھکمری میں تو ہم سب سے آگے
بنے طب و تعلیم میں سب کے تلچھٹ
لگے دینے آواز خود اپنی شامت
بھری ہے دماغوں میں ان کے غلاظت
کہ پھیلائیں ہر دن یہ ناکارہ نفرت
کریں جا کے ایواں میں خالی حجامت
ہے ان کی تو کوشش مٹے سب صحافت
رہے جو کرے حکمراں کی حمایت
وبا کو بھی جڑوا دیں دین و دھرم سے
ہوا کو بھی لڑوا دیں دیر و حرم سے
لگائیں یہ دل جا کے کوئی صنم سے
کرے دوسرا ان کے رحم و کرم سے
ہے ان کی نظر میں بڑا کوئی رخنہ
جو ذہنوں میں خناس ہے اک سمایا
یہاں سب کیا مجنوں کی اولاد ہی ہیں
محبت نہیں کرتے جیہاد ہی ہیں

قطعات

مصداق اعظمی
موضع۔جوماں

کبھی کسی سے بھی توقیر کے حوالے سے
کوئی بتا دے کہ ہم نے حسب نسب پوچھا
بس اپنے تاج کو رکھنا ہی سر پہ بھول گئے
کباڑ خانے کے گاہک نے بھاؤ جب پوچھا

یہ بھی پاکیزہ محبت کا اثر دیکھا گیا
عیش و عشرت ہی نہیں آوارگی بھی چھوڑ دی
ایک شہزادے نے اک خانہ بدوشن کے لئے
شیش محلوں سے ملی شہزادگی بھی چھوڑ دی

مرے لہجے کا مجھ میں کھردرا پن سانس لیتا ہے
مرے غم خوار تھوڑی فکر ریشم سی مجھے دے دے
مجھے احساس ہے میں خود کو وہ لگتا نہیں جو ہوں
نفاست کچھ دنوں کے واسطے اپنی مجھے دے دے